U3202 27·11·09

Title — Johar Ismat

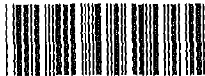
Author — Rashid Ul Khairi

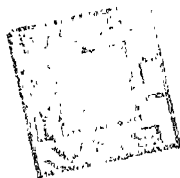
Publisher — Ismat Book Agency (Delhi)

Date — Not Available

Pages — 183

Subjects — Urdu Novel.





جو کچھ کیا خوب کیا، اری دیکھ تو سہی آسمان پر نظر ڈال، یہ لو پھر اندھیری دیکر
آیا، کس قیامت کی رات ہے، اے ہے ابھی تو ایک ہی بجا ہے۔

شکل و صورت کے اعتبار سے، وضع قطع کے لحاظ سے مجھ میں
اور شہزادی میں زمین، آسمان کا فرق ہے آنکھیں اس کی بھی دو ہی تھیں۔
مگر سیلی بھی بڑی بھی، خط و خال میرے بھی اس کے بھی، مگر وہ ایک چیز
ہے گورا بدن، قیامت کا نقشہ، اس روز دیکھا تھا، کچی چکن کی قمیص میں
بدن پھوٹ رہا تھا، ایک میں ہوں کہ سر جھاڑ منہ پھاڑ میلے کچیلے کپڑے
چیکٹ سراپا چھپاتا بدن، بسورتی صورت، روکھے بال، پسینہ کی بو، ایک
وہ ہے، بنی ٹھنی ہاتھ منہ سے درست، ناک کان سے آراستہ، مجھے تو
انّا نے دکھایا، کہ شہزادی یہ ہے، اتنی دور تھی مگر خوشبو کی لپٹیں یہاں
تک آرہی تھیں، عرفان سچ کہتا تھا کہ اس کے جسم سے خوشبو آتی ہے
لیسا نفس مکھ چہرہ تھا، حسن کی پوٹ تھی، معلوم ہوتا تھا کہ پری آرہی ہے،
شمیم جانور ہے اتنا نہیں سمجھتی کہ عرفان انسان ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے [illegible]
فطرت انسانی ہے، شہزادی جہاں کہیں سے سنتا ہے، ہر وقت [illegible]
لڑتی ہے میں بدنصیب تو پچھوں میں ایسی گھری کہ پانی تک
نہ رہی، پچھلے جمعہ کو کیسی محبت اور عنایت سے پیش آ[illegible]
بھلا کھانا آگے رکھا اس کے قابل ہرگز نہ تھا [illegible] کہ
میرا دل رکھ لیا اور کھانا سے بیٹھ گیا، کمبخت [illegible] پانی کو
دوڑی، تقدیر کی خوبی اس کو کہتے ہیں [illegible] سوتے
سوتے چیخ مار اٹھ بیٹھی، مجھ سے [illegible] دونوں [illegible]
آنکھ [illegible] عرفان [illegible] عرفان کی

اذیت ظاہر تھی، چہرہ سُرخ ہوگیا، آنکھیں باہر آگئیں، سانس رُکنے کے قریب ہوگیا، صغریٰ کو ترجیح دینے کا جذبہ بھی پوشیدہ نہ تھا، کہ بچی سوتے میں ڈر گئی یا مچھر پسّو نے کاٹ لیا، غرض سچ پوچھو تو دونوں ضرورتیں اس لئے کہ نوعیت بھی مختلف تھی مقابلہ کے قابل ہی نہ ہو سکتی تھیں، صغریٰ دو نہیں دس منٹ اسی طرح رو لیتی، مگر عرفان کے حلق میں پانی نہ جاتا، تو موت میں کیا کسر تھی، میں بدبخت بچی کی طرف جھک گئی، اس نے سچ کہا کہ بچی مرجاتی تو بلا سے اور جو میرا دم نکل جاتا؟ لڑکی ایسا روئی اور بلبلائی کہ بیٹھنا دوبھر ہوگیا مجبوراً اُٹھ کھڑا ہوا، شہزادی کے ہاں کیا ہوا خبر نہیں، مگر اس نے خاطر تواضع میں خدمت، محبت میں، کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہوگا۔ سُنتی ہوں کہ معمولی حرارت میں، رات رات بھر پاؤں دباتی ہے، میرے ہاں تو سخت سے سخت بخار چڑھا اور ان بچوں کی سلامتی میں کبھی سر پر ہاتھ رکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ ان حالات میں، عرفان جو کچھ کر رہا ہے، یقیناً درست ہے، وہ اُدہ مہینہ جب تک علی الصباح نہا نہ لے، اس کو چین نہیں پڑتا، میں ان بچوں کے طفیل آٹھ آٹھ دن بھی سر نہ گوندھ سکوں،

یاد نہیں کہاں، مگر میں نے پڑھا تھا کہ مرد کو مائل کرنے کے واسطے عورت میں تین صفتوں کا ہونا ضروری ہے۔ کشش، سلیقہ، خدمت اس کی رائے ہے، کہ کشش کا مادہ ہر نسوانی ہستی میں کم و بیش موجود ہے، اور محبت اس کی کمی کو ترقی دیکر ایک خاص درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ سب کچھ صحیح مگر میں ان تینوں سے محروم اور شہزادی ان تینوں جوہروں سے مالا مال ہے، حُسن کے اعتبار سے تو میں اس کا پاسنگ بھی نہیں، تھوڑی بہت کشش اگر تھی تو وہ ان بچوں کی بدولت جڑ چکی، رہا

سلیقہ اور خدمت وہ بھی ان بچوں کی نذر ہوا، ان ہی کی خدمت سے چھٹکارا نہیں اس کی کیا کروں گی اب ایمان کی تو بات یہ ہے، میرے پاس کیا ہے جس پر عرفان توجہ کرے۔ میں گریبان میں منہ ڈال کر دیکھوں تو معلوم ہو کہ عرفان جو کچھ کر رہا ہے، درست ہے اور شہزادی حق رکھتی ہے کہ عرفان اس کا مبتلا رہے۔

"بس! صغیرہ، بس! بہت باتیں بنا چکی خاموش! تیری منطق اور فلسفہ، رائے اور قیاس، بہت سنتے سنتے گھنٹہ بھر ہو گیا، اب زبان روک نہ کان نہ کھا۔ سنتے سنتے کلیجہ پک گیا، جو ہو رہا ہے اگر ٹھیک ہے تو ہونے دے، مگر دوسروں کو نہ جلا، اس جلے پر تیل نہ ڈال، اور زخموں پر نمک مت چھڑک۔ تو تیری رائے، تیرا مقابلہ سب لغو غلط اور جھوٹ.... بدنصیب دیوانی ہوئی ہے، گوہر آبدار کا مقابلہ کیچڑ سے، لال کا پتھر سے اور سونے کا مٹی سے نہیں ہوتا، ایک آوارہ بدکردار سے مقابلہ کر رہی ہے ایک شریف عزت دار کا جو عصمت سے محروم عورت کو سامنے لائی ہے اس عفت مآب لڑکی سے جس کا آنچل غیروں نے بھی نہ دیکھا۔ کیا انسانی دنیا کا کوئی معقول انسان اس بزم تخیل میں جہاں عصمت کی یہ دیویاں پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے معصوم بچوں کو سلانے کے لئے جفا شعار شوہروں کی بے اعتنائی اور نفرت کی لوری دے رہی ہوں، کسی ایسی ذلیل ہستی کا گذر جائز سمجھے گا جس کی قیمت چند روپے ہوں؟ میں جانتی ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ دور حاضرہ کے نوجوانوں نے ان تماشائی بازاری کو انسانیت کی عصمت [illegible] دی ہے، اور عصمت تار [illegible]

ہی گرد سے لیکن کائنات کے ہر ذرہ کی طرح مسلمانوں کا یہ دور بھی رہنے
والا نہیں! آسمان کی آنکھیں دنیا کے اس پردہ پر بڑے بڑے زبردست
انقلاب دیکھ چکی ہیں، تجھکو یاد نہ ہوگا، اور نہ ہونا چاہیئے یہ ہی لاڈو
میراثن کہنے کو بھنگن تھی مگر اس کا طنطنہ امیرزادیوں سے کم نہ تھا،
بیگم صاحب تیری چھوٹی دادی اس بھنگن کو اپنے ہاتھ سے پان بناکر
دیتی تھیں، محلہ اس کے نام سے تھرّاتا تھا اور ساری بہو بیٹیاں اس
کو جھک کر سلام کرتی تھیں دو بجے تک محلہ میں پھری، گھر گھر کی ٹوہ
لی، ادھر بڑے سرکار ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے ادھر وہ سامنے
آئی اور کہا،

"اللہ رسول کی امان"

بیویاں اور بیٹیاں بہوئیں، اور بھاوجیں بھر اگر تھا، مگر کس کی مجال
تھی کہ لاڈو میراثن کے وقت بڑے سرکار کے پاس پھٹک تو جائے،
پوری ڈیڑھ گھڑی بیٹھی اور محلہ کا کچا چٹھا سنا دیا، کس پر فاقہ ہے، اور
کتنا ننگا، میری یہ آنکھیں جن میں آج پانی اُتر رہا ہے وہ سماں دیکھ چکی ہیں
لاڈو اٹھی دعائیں دیں اور سرکار نے اپنی ڈبیا میں سے اس کو پان
دیا، اس آن بان کی عورت محض اتنی بات پر کہ حسنا طوائف سے باتیں
کرتے سرکار نے دیکھ لیا، ایسی راندہ درگاہ ہوئی کہ محلہ میں قدم رکھنا
[illegible] تھا، بہتیرا ہی سر پٹکا خود بیگم صاحب نے سفارش کی مگر پھر سرکار نے گھر
میں نہ گھسنے دیا۔ اور یہی کہا کہ طوائف سے ملنے والی کا بہو بیٹیوں میں کیا
کام، سرکار مر گئے اور مجھکو مرنا ہے مگر وہ [illegible]
لاڈو مرتے مر گئی مگر محلہ کی چوکھٹ پر چڑھنا نصیب نہ ہوا، [illegible]

ذکار اللہ، نذیر احمد جیسی مقتدر ہستیاں آج فنا ہو چکیں اور ان کا دور دو دیکھنے والے بھی چلد سے اور جا رہے ہیں، مگر ابھی دلی کے کونے کھدرے میں ایک آدھ بڑا ایرا با ایسا نکل آئے گا جس نے وہ رنگ دیکھا ہے کہ آن کی چار دیواریوں میں غیر عورت کا داخلہ حرام تھا۔

یہ بھی مسلمانوں کا ایک دور تھا، اور اس وقت آج بھی ایک دور ہے کہ ادب کے قابل قدر ذخیرہ آئدہ حسن فروشوں کے ذکر خیر سے لبریز ہیں کہیں انگلیوں کی تھرتھراہٹ ہے، کہیں کلائی کی کپکپاہٹ کوئی گردن کی مٹک پر فریفتہ ہے، کوئی کمر کی لچک پر، یہ مضامین بجائے خود عیاشی کا معقول اشتہار ہیں اور نوجوانوں کو آوارگی پر مائل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ مگر جس طرح مرجھائے ہوئے پھول اور بجھی ہوئی شمع صحبت شب کا پتہ دیتی ہے، اسی طرح موجودہ ادب اُردو عہد مستقبل میں دور حاضر کی طبیعتوں کا آئینہ ہوگا، اور یہ وہ وقت ہوگا کہ برادری ‌(سوسائٹی) اپنا منہ پیٹ لے گی، ہر ملکے، ہر رسمے، مشہور مقولہ ہے مغرب نے عورت کی آوارگی کی پیٹھ بھر کر اور جی کھول کر داد دی لیکن مشرق نے اس کی عفت کو سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا۔!

رقاصہ کی ضیا پاش نظروں پر بے تاب ہونے والے اور ان کے ٹھمکوں پر سر دھننے والے اتنا ملحوظ رکھیں کہ وہ مسلمان ہیں، ہندوستانی ہیں اور آنیوالی نسلوں کے لئے کچھ چھوڑ رہے ہیں یا!

بدنصیب قوم جس کا شیرازہ بکھر چکا اگر کبھی حقیقتاً قوم ہوئی اور ادب کا یہ قابل قدر ذخیرہ اس منزل پر پہنچا جس کو زبان سے نکالتے ہوئے اس لئے ڈر لگتا ۔ شروع ہوگا اور جس کا نا

مذہب ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا حشر ہوگا۔

صغیرہ ترقی کے میدان میں اتنی سرپٹ نہ دوڑ کہ کھائی اور کنواں کچھ نہ دکھائی دے پکارنے والوں کی طرف بھی مڑ کر دیکھ لے شاید کوئی بات کام کی نکل آئے۔ صغیرہ سرزمین ہند کی آغوش میں ابھی اس ان پڑھ عورت کی ہڈیاں موجود ہیں جس نے سحر البیان جیسی کتاب کو سانڈے کا تیل کہدیا تھا“

”میں اس گھڑی کو نہیں پاتی جب تجھ سے تعلق ہوا۔ تو نے مجھکو دھوکا دیا اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ آنکھوں پر پردہ پڑ گیا، تو تو کہتا تھا کہ میں دو لاکھ کی جائداد کا مالک ہوں وہ کہاں گئی میں نے محض تیرے بھروسہ پر لطیفن سے ملنا چھوڑا، دیکھ لے اس نے فیاضی کو کیا سے کیا بنا دیا ہر وقت اس کے دروازہ پر موٹر موجود ہے، پرسوں ہی استاد کہہ رہے تھے کہ اٹھارہ سو کی پشواز تیار ہوکر آئی ہے وہ کس چیز میں مجھ سے اچھی ہے، شکل میں صورت میں گانے میں بجانے میں، ہاں سمجھدار ضرور ہے کہ کسی کے راگ میں نہیں آتی، پنجابی والے کے ہزاروں ڈکار گئی اور جب وہ کھک ہوا تو کوٹھے پر قدم تک نہ دھرنے دیا آخر میں کب تک یہ مصیبت بھگتوں تیری بدولت یہاں تک نوبت پہونچ گئی کہ بدن کے سوا کپڑوں کا کوئی جوڑا میسر نہیں، ہو کہاں سے اگر کوئی آنے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو تیری صورت دیکھکر کوسوں دور بھاگ جاتا ہے، اس بُرے حالوں کب تک گذرے گی؛ تیرے منہ پر تو آنکھیں نہیں ہیں کہ دن بھر یہیں بیٹھا رہتا ہے۔ [illegible] کہ دن بھر کے لئے تو میرا پیچھا

بچھونا پایا سے کوئی مرا جیتا آئے تو گھنٹہ آدھ گھنٹہ بٹھا کر کچھ پوچھوں، عرفان
بُرا مانیں یا بھلا مجھ سے یہ مصیبت نہیں جھیلی جاتی، یا تو پورے خرچ کا
انتظام کر یا اپنا منہ کالا کر کہ پاپ کٹے۔"

(شہزادی)

"شہزادی کی بیماری سے بالخصوص اسلئے کہ تم پریشان ہوگے
بڑی افسوس ہوا خداوند کریم اس کو صحت دے اور تم پر اپنا فضل کرے
میرے پاس جو کچھ تھا وہ تمہارے سامنے تھا اور اب جو بچا ہے وہ تمہارے
علم میں ہے، صغریٰ کے کپڑے حاضر ہیں شوق سے لیجاؤ۔ بچہ پہنا گئے
میں اُتاروں گی تو روئے گی، ضد کرے گی، رات کو اُتار رکھوں گی، صبح کو
لیجانا، میرے پاس چوتھی کا جوڑا رہ گیا ہے، بنا تو ہزار بارہ سو میں تھا،
اب مشکل سے سو ڈیڑھ سو ملیگا، لاکھ کا مول ہے لے کا نہیں، ضرورت
ہے تو تم پر سے قربان کیا، خوشی سے لیجاؤ، میں تو اب پہننے سے رہی
رہ جاتا تو صغریٰ ہی کے کام آجاتا اگر خدا کو منظور نہیں تو بسم اللہ ابھی
لادیتی ہوں۔"

(صغیرہ)

"آپ مجھ پر بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ میرا اس مال سے مطلق
تعلق نہیں، یہ دونوں کرسیاں محمود میراسی لایا، اور اس نے میرے سامنے
شہزادی کے ہاتھ ساڑھے چار روپیہ کو بیچیں، ململ کا تھان میرے
فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ وہ کب آیا، اور کون لایا، شہزادی کا یہ بیان کہ میں
چرا کر لاتا ہوں اور یہ مال مسروقہ میری ملکیت ہے قطعاً غلط ہے مجھے اس
کا اقرار ہے کہ تین ساڑھے تین سال سے میرا اس کا تعلق ہے اور اس

عرصہ میں جو کچھ میرے پاس تھا وہ سب اس کی نذر کر دیا، اب چونکہ میرے پاس کچھ نہیں، اس لئے اس نے اپنے آشنا کو بچا کر مجھے پھنسوا دیا آپ نے مجھے مجرم قرار دیکر گرفتار کر لیا، اور یہ صرف اس کے کہنے سے آپ اس جرم میں میرا چالان کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ مجھ کو سزا ہوگی کیونکہ میری پیروی کرنے والا کوئی نہیں ایک بیوہ پریشان بیوی ہے جس کا تل تل اور تار تار میں نے شہزادی کو کھلا دیا، ایک آٹھ سال کا معصوم بچہ ہے جس کی طرف کبھی میں نے محبت کا ہاتھ بڑھایا اگر آپ ایک بیگناہ کو سزا دلوانا جائز سمجھتے ہیں تو پھر آپ کی خوشی مگر میں پھر کہتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب! میں بے گناہ ہوں!" (عرفان)

رات کے دس بجے یا بجنے والے تھے، شہر کے مشہور وکیل چیٹر جی اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر آرام کرسی پر بیٹھے کسی خاص خیال میں غرق تھے بجلی دھڑا دھڑ جل رہی تھی کہ دروازہ میں آہٹ ہوئی، اور چیٹر جی اپنا خیال چھوڑ کر ادھر متوجہ ہوئے تو دیکھتے ہیں کہ ایک برقعہ پوش عورت چھوٹے سے بچہ کی انگلی پکڑے سامنے کھڑی ہے چیٹر جی کے اندر بلانے کے اصرار پر یہ عورت کچھ آگے بڑھی اس کے قدم رکتے تھے، اس کا دل دھڑکتا تھا، بولنا چاہتی تھی مگر آواز نہ نکلتی تھی چیٹر جی کے کہنے سے وہ کرسی پر بچہ کو لئے ہوئے بیٹھی، اس کا جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا، اور اس کے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے، بمشکل تمام رک رک کر اور تھم تھم کر اس نے اس طرح کہا:

"وکیل صاحب! اس بچہ کا باپ اور میرا شوہر عرفان شہزادی کے

مکان سے آج چوتھا روز ہے کہ چوری کے الزام میں گرفتار ہوا"

"کیا تم مرزا ایوب بیگ ڈپٹی کلکٹر کی لڑکی ہو؟"

"اس سوال کی چنداں ضرورت نہیں، میں اگر ہوں بھی تو مرزا صاحب کی شخصیت ابراہیم لودی سے زیادہ نہ تھی، جس کی ماں کا دنیا نے اس طرح تماشا دیکھا کہ سفید چادر میں لپٹی ہوئی کپکپاتے ہاتھوں سے ہمایوں کی خدمت میں کوہ نور نذر کر رہی ہے!

میں نے جس وقت سے اس گرفتاری کی خبر سنی ہے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، ہوش حواس درست اور عقل ٹھکانے نہیں ہمارا وارث اگر کوئی ہے تو صرف وہ، میرے پاس مقدمہ کو مرد یا عورت کوئی نہیں سنتی ہوں کہ بیوفا شہزادی نے جس کے کارن وہ مست گیا اس سے دغا کی، اور بے خطا بے قصور پکڑوا دیا، اس کی گرفتاری مجھکو پردہ سے باہر کھینچ لائی، اور آج یہ وقت ہے کہ جس کا آنچل بھی کسی نے نہ دیکھا وہ آپ سے دلیرانہ بیٹھی باتیں کر رہی ہے، اور اگر ضرورت ہوئی تو میں اپنی جان اپنی عزت سب قربان کر دوں گی اور عدالت تک پہونچوں گی وہ سیدھا سادہ آدمی ہے خدا معلوم شہزادی کمبخت نے کیا چکمہ دیا، آپ کا ایمان اگر اجازت دے تو ایک بے گناہ کی حمایت کیجئے اور اسکو عدالت کی رسوائی سے بچائیے، دنیا میری آنکھوں میں اندھیر میرے دل میں آگ لگ رہی ہے، کل مقدمہ ہے لیکن یہ رات جس کی ہر گھڑی قیامت سے کم نہیں، ابھی مجھ کو بسر

مجھ کو کوئی حق نہیں کہ میں آپ کو وقت تکلیف دوں، اور کوئی شخص

نہیں کہ آپ خواہ مخواہ میرے کام آئیں، یہ میرا ہار ہے جو جہاں تک مجکو یاد ہے ہزار روپئے کا خریدا گیا تھا، اس میں سے جسقدر آپکا منشا ہو لے لیجئے، اور مجھے اس کی شکل دکھا دیجئے، جو میرے آقا، میرا مالک اور میرا خاوند ہے۔"

دن کے دس بجے تھے کہ عرفان پا بجولاں حوالات کے کمرہ میں لایا گیا، وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اسکو شہزادی معہ اپنے اعزا و احباب کے بنی ٹھنی دکھائی دی، عرفان کی نظر پڑتے ہی شہزادی کے چہرہ پر مسکراہٹ آئی مگر بدنصیب عرفان اب بھی نہ سمجھا کہ شہزادی کیا ہے اور اس کے دل میں کس قسم کے جذبات موجود ہیں اس نے اعانت کے واسطے اس کی طرف رخ کیا اور صرف اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ "سخت مصیبت میں ہوں مجھے تجھ سے یہ توقع نہ تھی"

کہ محمد دستار باز نے زور سے قہقہہ مارا، شہزادی کی ہنسی نے محمد کی ہاں میں ہاں ملائی اور عرفان اپنی حالت پر لعنت ملامت کرتا روتا ہوا اندر داخل ہوا، ثبوت کے گواہوں میں سب سے زبردست شہادت شہزادی کی تھی جس نے ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر عرفان پر جرم ثابت کیا، ابھی شہزادی کی شہادت ختم نہ ہوئی تھی کہ چپڑاسی نمودار ہوئے، اور ان کی جرح پر استغاثہ کی تمام شہادت کا خاتمہ ہوگیا۔ ٹھیک بارہ بجے تھے کہ عرفان رہا ہوا۔ اس کے باہر نکلتے ہی شہزادی اور اس کے رفقاء کا خون خشک ہوگیا، جتنی شہزادی کی آنکھیں کھلی جاتی تھیں عرفان کی صورت دیکھ کر یہ کیفیت ہوئی کہ گویا سانپ سونگھ گیا، جو ٹکٹکی لگائے

میں دیکھ کر زور سے ہنسی تھی، وہ رہا دیکھ کر دم بخود رہ گئی،
عرفان کچھ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ چٹرجی اس کے پاس آئے
اور کہا،

"وہ حسن جس سے بہرہ اندوز ہونے کا ہر آنکھ حق رکھتی ہو
وہ حسینہ جس کی باتوں سے مسرور ہونے کا ہر شخص مدعی ہو
سکتا ہے، وہ عورت جس کے پاس ہر بدمعاش چند دام جیب
میں ڈال کر بلا روک ٹوک پہونچ سکتا ہے، وفا کے جوہر
دکھا چکی، تم بیوقوف تھے سادہ لوح تھے ناتجربہ کار تھے تم
نے جس کو حسن سمجھا وہ فریب کی گٹھری اور جس کو دوست خیال
کیا وہ دغا کی مورت تھی جن آنکھوں نے تم کو مسحور کیا، ان کی تہ
میں مکر کے چشمے تھے اور جن اداؤں نے تمہارا دل مسخر کیا وہ سراب
و حباب سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں، پھوٹ جانا بہت بہتر
تھا اس آنکھ کا جو فانی جلوؤں کی داد دے، اور فنا ہو جانا
زیادہ بہتر ہے اس دل کا جو ان سیمابی کرشموں سے متاثر نہ ہو۔

آج وہ وقت ہے کہ اگر ایمان کی روشنی تمہارا ساتھ
دے اور تم انصاف کی آنکھ سے دیکھو تو ان قدموں پر سر
رکھ کر قربان ہو جاؤ جو باپ دادا کی لاج گنوا کر سر راہ تمہاری
رہائی کی کوشش میں آ بیٹھی، تمہارے خسر مرزا صاحب میرے
گہرے دوست تھے، میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھتا تھا، صغیرہ
میرے سامنے چھوٹی سے بڑی ہوئی وہ جس ناز و نعم سے پلی

اُسے میرا بھی دل جانتا ہے، میری آنکھ کے سامنے معمولی شکایت پر ڈاکٹروں کا تانتا لگتا تھا، خدا کی شان ہے کہ وہی صغیرہ آج تمہارا شکار ہو کر اس قابل ہو گئی کہ وضع حمل کے وقت بھی اس کے پاس ایک متنفس نصیب نہ ہو۔

تم مسلمان ہو کیا تم ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ عورت کی خلقت سے قدرت کا یہ منشا ہے کہ وہ صرف اپنے دامِ محبت میں مرد کو گرفتار رکھے اور بہارِ حسن میں کبھی خزاں نہ آنے دے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اسلام یہ نہیں کہتا یقیناً نہیں کہتا، بلکہ وہ تلقین کرتا ہے بقا نسل کی، اور اعزاز و احترام کرتا ہے اس عورت کا جو ماں کی حیثیت میں نمودار ہوئی، تم اگر مذہب سے واسطہ نہ بھی رکھو تو تم کو کم از کم یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ صغیرہ کی بربادی کا باعث تم، اور صرف تم ہو، اس پر پھول کی مصیبت لانے والے تم۔ اور اس کو بد سلیقہ منہپھٹ اور پھوہڑ بنانے والے تمہارے بچے جن کی وجہ تم تم اور یقیناً تم ہو!!

وہ کنوارپنے میں بھی صغیرہ تھی اور ایسی تھی کہ اس کا حُسن اس کا سلیقہ اس کے کام کنبے بھر میں مشہور تھے وہ ایسی تھی کہ تم اور تمہارے باپ اس کی چوکھٹ کو سجدہ کرکے چوم چاٹ کر لائے تمہارے ہاں آکر صغیرہ وہی تھی مگر تم نے اس کی حالت میں تغیر پیدا کیا اور اس تغیر کے ذمہ دار تم ہو ......

تم مبتلا ہوئے شہزادی کے جو نسوانیت کے سب سے اعلیٰ جوہر سے محروم تھی، اور اتنا نہ سمجھ سکے کہ صغیرہ کے سپیلے

کپڑوں پر شہزادی کے ایک نہیں ہزار پشواز قربان اس کے روکھے بال جو امت کے بیش بہا جھومر سے مزین تھے۔ داستان انقلاب تھے، تصویر تغیر تھے، تم سنتے وہ سناتے تم دیکھتے وہ دکھاتے، اس لئے کہ وہ عصمت کے سدا بہار پھولوں سے مہک رہے تھے۔ حق رکھتے تھے۔ اور شہزادی کے بنے ہوئے بال اس کو سجدہ کرتے۔

تم شاید اس ہار کو پہچان سکو جو تمہاری رہائی کا باعث ہے۔ یہ وہ ہے جو ڈپٹی صاحب مرحوم نے میری معرفت بنوایا تھا اور جو شب گذشتہ کو صغیرہ بیگم نے مجھے محتاج خانہ میں دیا، اور جو میں نہایت خوشی سے اس دعا کے ساتھ واپس کرتا ہوں کہ یہ صغیرہ بیگم کو نصیب ہو۔

عرفان میاں! میں تمہارے نکاح میں موجود تھا مجھے تعجب ہے کہ خطبہ نکاح سے قبل جو وعدے تم نے کئے تھے وہ ایفا نہ کر سکے اور جن کے ایفا کی اسلام نے سختی سے تاکید کی ہے!!

چٹرجی اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ پیپل کے درخت سے جو ان کے سر پر تھا ایک بلبل خوش الحان کے چہکنے کی آواز آئی جس نے باواز بلند کہا،

مِیْثَاقًا غَلِیْظًا (گاڑھے عہد)

چٹرجی کی تقریر سے عرفان کی ہچکی بند ہو گئی وہ ہر چند ضبط

کرنا چاہتا تھا مگر دل اندر سے اُمڈا چلا آرہا تھا، اس طرح روتا ہوا گھر پہنچا، تو ادہر صغیرہ کے احسانات ایک ایک کرکے سامنے آنے شروع ہوئے ادہر اپنے مظالم کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی، طبیعت اور زیادہ بگڑی بہتیرا سنبھلنا چاہا نہ سنبھل سکا چوکھٹ پر قدم رکھا تو اندر جانے کی ہمت نہ پڑی بہ مشکل تمام اندر داخل ہوا تو دیکھا بدنصیب بیوی جا نماز پر بیٹھی گڑگڑا کر معبود حقیقی کے آگے عرفان کی رہائی کے واسطے دعا مانگ رہی ہے۔

بھور کی دولھن

بادشاہی باغ جس نے صاحبقران ثانی جیسے جلیل القدر شہنشاہ سے لیکر بیچارے بہادر شاہ تک کے جلوس اپنی آنکھ سے دیکھے تھے خواتین مغلیہ کے قدم اپنے سر آنکھوں پر رکھے۔ دلی سے چار میل شاہدرہ اسٹیشن کے قریب واقع ہے متواتر پانچ ساڑھے پانچ صدیوں تک بادشاہی باغ نے جو عیش کئے ہیں اس کی نظیر پردہ دنیا پر مشکل سے ملے گی برسات کے موسم میں باغ کا اندھیری حصہ ایک طلسم کدہ تھا آم اور جامن کے گنجان درخت زمین میں اس طرح جھول رہے تھے کہ مالی اور باغبان تو در کنار بہتر سے بہتر صناع دنگ رہ جاتے تھے ڈھائی تین فرسنگ درختوں کی یہ دو رویہ قطار اس طرح پر چھائی ہوئی تھی کہ چھاجوں پانی پڑ جاتے مگر ایک قطرہ زمین پر نہ پہنچے۔ اندھیری حصہ کی مشرقی سمت پر جمنا لہریں لیتی تھی ساون بھادوں کی اکثر راتیں اور بیشتر دن مغل بادشاہوں نے اس باغ میں بسر کئے۔ جب اودی اور سیاہ گھٹائیں آسمان پر چھائی تھیں بجلی کوندتی تھی بادل گرجتا تھا تو یہ سیر کے رسیا جھولوں کا لطف اٹھاتے تھے، گنگا جمنی ڈوریاں اور روپہلی سنہری پٹریاں پڑتی جاتی تھیں۔ قلعہ معلی کی پریاں لال سبز جوڑے پہن پینگیں چڑھاتی تھیں اور جھولنے والیوں کی جھنجھیری آوازیں زمین سے اٹھ کر کوئل کی کوک اور پپیہے کی صدا سے ٹکراتی تھیں۔

آج باغ کی کل کائنات چند درخت ایک ٹوٹی ہوئی محلسرا اور شکستہ

دیوار میں ہیں۔ تسلیم پسند کنواں زندہ تو ہے مگر کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا
جہاں آدمیوں کی کثرت سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی وہاں اب دن دہاڑے
گیدڑ پھرتے ہیں۔ وسط باغ میں فیروز خاں تاتاری بلوچ کی جھونپڑی ہے
جو ان درختوں کی رکھوالی کرتا ہے اور اپنی جوان لڑکی فیروزہ کو لئے ہوئے
زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

(۳)

شمع آفتاب جھلملا جھلملا کر دم توڑ رہی تھی روز روشن کا جنازہ دفن کے
قریب تھا اور بادشاہی باغ کے درخت جو قبروں میں پاؤں لٹکائے کھڑے
تھے اپنے دور شباب کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ پتوں کی موسیقی اور
پرندوں کا نغمہ شام کا گجر بجا رہا تھا۔ کہ فیروزہ اپنے میلے دوپٹے کے
بائیں آنچل کو کندھے پر ڈالتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی اس کی کٹیا
مصنوعی دنیا کے جھوٹے تکلفات اور ان سامانوں سے جو امیر زندگی کا جزو
ہو گئے ہیں پاک تھی مگر اطمینان کی ایک خاموش مسرت گھاس
پھونس کے اس ڈھیر پر برس رہی تھی۔ شباب کا یہ مجسمہ حسن پر حسن
قربان ہو رہا تھا، زندگی کے تمام آلام و افکار سے صاف تھا وہ جوانی
کے جذبات سے قطعی ناآشنا تھی مگر ایک نامعلوم طاقت اس کے
دل میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا؟

(۴)

حسین علی زمیندار کا لڑکا احسن صبح سے جمنا کے کنارے شکار
کھیل رہا تھا، فاختاؤں اور مرغابیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے نوکر چاکر
دو ایک احباب آٹھ دس آدمی اور پانچ چھ بندوقیں ہمراہ تھیں احسن

اپنی کامیابی پر خوش اور مصاحب نشا مد کی داد دینے میں سرگرم تھے وہ دولت کے نشہ میں جھوم رہا تھا، اور کتابِ عمر کا ہر ورق بتا رہا تھا کہ ناکامی کا وجود اس دنیا میں صرف مفلسوں کے واسطے ہے دوپہر کا دسترخوان انواع و اقسام کی نعمتوں سے لبریز تھا کچھ کھٹتی کچھ بھنگنیں کچھ کہار کچھ چمار بھور بھور کہہ کر پیٹ بھر رہے تھے۔ ان کلیوں کی طرح جن کے شگفتہ ہوتے ہی شہد کی مکھیاں اور بھونرے سر وقت بھنبھناتے رہتے ہوں جنہوں نے کبھی بھول کر بھی کلفتوں کی صورت نہ دیکھی ہو احسن کے دولتمند کان خوشامد سے بھرے ہوئے تھے جوانی کی رعونت رگ رگ میں موجود تھی اس پر دولت کی افراط دلت عید تھا رات شب برات زمیندار گاؤں کا خدا ہوتا ہے آسامیاں رعیت نہیں بندے ہوتے ہیں ان کی دولت ان کا گھر اُن کی عزت اُن کا مال و متاع ملکیت ہوتا ہے زمیندار کی۔

احسن نے اسی اصول میں آنکھ کھولی اور ان ہی خیالات میں پرورش پائی۔ سچ پوچھو تو باپ کی زندگی ہی میں گاؤں کا بادشاہ بن چکا تھا۔ اکلوتا بچہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اس کا حکم ٹالے ابھی پندرہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ اُس نے ایک معمولی بات پر ایک دھوبی کا مکان اپنے داروغہ کو دلوا دیا۔

(۴)

شام ہونے لگی تو احسن نے منہ ہاتھ دھویا۔ شکاری لباس تبدیل کیا۔ چاء پی۔ اور ایک مصاحب سے کہا۔ میر صاحب! اجیت صاحب شکار کو گئے اور خاک نہ ملا۔ منچلے میاں نہیں مانتا

حیران رہے اور چڑیا کا بچہ نہ لائے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ خالی ہاتھ کس طرح آتے ہیں۔ ہم کو تو ہمیشہ اتنا ملتا ہے کہ ڈھویا نہ جاتا ہے۔ یہ دیکھئے پرے کے پرے لگے ہوئے ہیں اصلی بات یہ ہے کہ میرا فیر آج تک خالی ہی نہیں گیا۔

میر صاحب۔ سرکار آپ کی بات آپ کے ساتھ ہے حضور کا تو ارادہ ہی شکار کے واسطے ملک الموت ہے ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دو شخص ہیں ایک تو نواب حیدر آباد اور ایک حضور جن کا نشانہ خطا ہی نہیں ہو سکتا۔

احسن۔ مجھے تو انگریزوں پر تعجب ہے کہ وہ بھی میرے نشانہ کی تعریف کرتے ہیں۔

میر صاحب۔ جی ہاں کلکٹر صاحب کے خانساماں نے مجھ سے خود کہا کہ صاحب تعریف کرتے ہیں۔

احسن۔ یہ لوگ اصل میں پینترے کے قدردان ہیں پچھلے موقعہ پر صاحب کے ساتھ میں نے بھی کئی فیر کئے یہ اتفاق تھا کہ سب خالی گئے مگر صاحب نے پینترا بہت پسند کیا۔

میر صاحب۔ حضور یہ تو حکومت ہی پینترے کی کرتے ہیں۔ یہ جو دن رات قواعد اور پریڈ ہوتی ہے۔ یہ ہے کیا؟ بس پینترا۔

احسن۔ میر صاحب! ہاں وہ دھوبی کا کیا ہوا۔

میر صاحب۔ بھلا حضور کے حکم کو کوئی ٹال سکتا ہے۔ رعیت کی مجال کیا ہے کہ اُف کر سکے۔

احسن۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مکان دھوبی ہی کا ہو گا مگر اس

کے اکڑنے پر مجھے غصّہ آگیا۔

میر صاحب۔ حضور نے اس کو بہت اچھی سزا دی اب ایک درخت کے نیچے بال بچوں کو لے کر پڑا ہے بس عمر بھر کو ٹھیک دگیا۔

احسن۔ ان کمینوں کو اسی طرح درست کرنا چاہیئے۔

میر صاحب۔ آؤ ذرا بادشاہی باغ کی سیر کریں۔

(۵)

آسمان کی بساط اور زمین کا دامن دونوں آفتاب و ماہتاب کے ظاہری اثرات سے پاک تھے درختوں کے قہقہے فضائے آسمانی میں گونج رہے تھے جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہلکی ہوا سرسبز پتیوں کو گدگدا رہی تھی۔ جامن کی خاموش پھلننگ پر بیٹھا ہوا ایک طائر شاہی باغ کے انقلاب کا مرثیہ پڑھ رہا تھا رات چودھویں تھی اور کائنات کی آنکھیں قمر چہار دہم کے واسطے آسمان پر لگی ہوئی تھیں کہ شاہی باغ کی کٹیا سے زریں چاند برآمد ہوا۔ حسن کی مجسم تصویر فیروزہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی چاروں طرف دیکھا۔ بادشاہ پسند کنویں پر آکر پانی بھرا اور پانی کے دو گھڑے لے کر کیاریوں میں آئی۔ رنگ برنگ کے پھول کھل رہے تھے اور ہوا نے باغ کو معطر کر رکھا تھا چنبیلی کے درختوں میں پانی دیا جوئی اور موتیا کو ٹھیک کیا۔ گلاب کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ ایک شاخ کے دو پھول ہوا میں جھوم جھوم کر گلے مل رہے ہیں، فیروزہ ابھی اس جذبہ سے جو اس سلسلہ میں کام کر رہا تھا قطعًا ناآشنا تھی مگر فطرت نے پھولوں کی اس

حرکت پر اس کے قلب میں ایک آگ لگادی وہ جھک گئی ہوا کا جھونکا زور سے آیا پھولوں نے ایک دوسرے کے منہ چومے اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کے گلے ملنے میں باغ کا ایک تیسرا پھول فیروزہ بھی شریک تھی وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی مگر بے خبر تھی کہ کیوں، اور نا واقف تھی کہ کیا؟۔

فیروزہ کی خاموش انگلیاں پھولوں سے کھیل رہی تھیں وہ کبھی پھولوں کو ہونٹوں سے لگاتی کبھی سر پر رکھتی اور پھر چھوڑ دیتی۔ پھول ہوا کے دریا میں تیرتے اور وہ ان سے لپٹ جاتی آن کا حسن تصنع سے پاک تھا اس کی آنکھیں سرمہ اور کاجل سے صاف تھیں اس کا چہرہ پوڈر سے اس کا لباس لونڈر سے اُس کے ہاتھ چوڑیوں سے اس کا سینہ زیور سے ہزاروں کوس دور تھا۔ لیکن وہ اس پر بھی ایک مجموعہ تھی ان خوبیوں کا جن پر قدرت خود فخر کر رہی تھی سیاہ اور گھن دار بال خوبصورت چہرہ کی کروٹوں میں آپڑے تھے اور اس کو مطلق خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ پھولوں کی نازک پنکھڑیاں اپنی کامیابی پر نہال تھیں۔ آم کا درخت سر پر چھایا ہوا تھا کہ بلبل کے نالہ نے اس کو چونکا دیا۔ پریشان بال درست کئے سامنے دیکھتی ہے تو ایک نوجوان گم سم ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے "تاتاری خون رنگ لایا" غیر نظریں دیکھتے ہی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں مگر خون کا یہ دورہ طیش وغضب میں بجھا ہوا ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ کہ ایک متضاد جذبہ نے یہ بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی کی۔ بلند آنکھیں نیچی ہوگئیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ شوق نے نیچی نگاہیں پھر بلند کیں اور آناً فاناً [illegible]

فیروزہ کے قلب پر گذر گئیں جذبۂ غیظ جل بجھ کر تلاش سے بدلا۔ تلاش نے شوق کی ہیئت اختیار کی اور آخری طاقت جس نے دوبارہ آنکھیں جھکوا دیں نسوانیت تھی۔ یہ سب کچھ ہوا، اور ہو چکا، مگر فیروزہ اب تک یہ نہ سمجھ سکی کہ کیا ہوا۔

(۶)

"تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تین روز سے مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں یہ تمام عمر میں پہلا اتفاق ہے کہ مجھکو اس قسم کی تکلیف ہوئی تم سب فضول باتیں کر رہے ہو اور اتنا نہیں ہوتا کہ اس کو یہاں تک لاؤ وہ عورت نہیں حور ہے جو بادشاہی باغ کی جنت میں رہتی ہے۔ ایک ہیرا ہے جو گلاب کی کیاری میں چمک رہا تھا، ایک چاند ہے جو باغ میں اُتر آیا تھا تم لوگ نمک حرام ہو اور باتیں بنانے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ (احسن)

غریب پرور۔ اس بدنصیب فیروز خاں کے سر پر تو قضا سوار ہے کہ نمک حرام نے بل بھر آخر اُجڈ گنوار ہے۔ اکڑ گیا اس نے یہ نہ سوچا کہ کیا وہ اور کیا سرکار۔ اس کے سر پر موت کھیل رہی ہے، اس کی ہستی کیا ہے کہ دم مار سکے اپنی اصلیت کو نہیں دیکھتا فقط حضور کے حکم کی دیر ہے ہم تو فیروز کو جان سے مار ڈالیں"۔ (ایک مصاحب)

دوسرا۔ مگر وہ لڑکی بہت خوش ہے بی محلانی کہہ رہی تھیں کہ تجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی بیٹھا تو تکتا رہا اور وہ ہنستی رہ گئی۔

چوتھا مصاحب۔ اور میں کچھ اور ہی کہہ رہا ہوں یہ سب بلوچ

کی ترکیبیں ہیں وہ جانتا ہے کہ سونے کی چڑیا ہاتھ آگئی اس وقت جو چاہو لیا
گا وہ لوں گا اس سے اچھا موقعہ پھر نہ ملیگا کچھ تھوڑی سی زمین اینٹھ لیا
گا بس یہ سارا ڈھونگ اس کا ہے۔

بھئی بہت ٹھیک (۱)
بے شک (۲)
بے شک بے شک (۳)
بس پتہ چل گیا (۴)

پہلا۔ ہاں یہ کون کہہ رہا تھا کہ اسے سرکار حکم دیں تو اسی وقت کام ہو جائے۔
دوسرا۔ اور اس میں کلام ہی کیا ہے۔
تیسرا۔ سرکار نے بلوایا تھا اس نے انکار کر دیا۔
چوتھا۔ "یہ تو حد ہو گئی"۔

(۷)

احسن اور اس کے مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا
منت خوشامد کی زبردستی کی، ڈرایا دھمکایا سمجھایا، بجھایا، مگر فیروز کا دل
نہ پگھلا سکے یا وہ ج تھا تو ایک ٹانگ کا آدمی لیکن غیرتمند قوم کا جری فرد
وہ کھری کھری سنا ہیں کہ سب منہ تکتے رہ گئے فیروزہ صبح کے وقت
ایک ہندو رئیس کے ہاں جھاڑ پونچھ روزانہ ڈالی دیکر جاتی تھی اب اس کے
سوا چارہ نہ تھا کہ گھنٹوں پہلے کنارہ دریا پر آبیٹھتا۔ اور فیروزہ کی صورت

دیکھ لینا اس نامعلوم کیفیت سے جو اندر ہی اندر فیروزہ کو زیروزبر کر رہی تھی اب پردہ اُٹھنے لگا اور وہ اتنا سمجھ گئی کہ جس بیباکی سے میری آنکھیں آج تک کائنات کی ہر شے کا مطالعہ کرتی تھیں احسن کیطرف جانے میں اس بیباکی کے ساتھ کوئی اور چیز بھی شامل ہے جو وقتاً فوقتاً رنگ بدل رہی ہے۔ کبھی حیا دامنگیر ہوتی ہے کبھی شوق کبھی تعجب اور کبھی تلاش، ایک مہینہ سے زیادہ اسی طرح گذر گیا اور اب فیروزہ کا معصوم قلب محبت کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ وہ جب علی الصباح اُٹھتے ہی رائے صاحب کے ہاں جانے کی تیاری کرتی تو ادائگی فرض کے ساتھ ہی احسن کو دیکھنے کی بھی ایک مسرت پاتی جون کا دوسرا ہفتہ تھا گرمی شدت سے پڑ رہی تھی جمنا پایاب ہوگئی تھی اور پاٹ بہت مختصر ایک روز جب فیروزہ بیچ دریا میں تھی اس کا پاؤں پھسلا اور گری۔ رنگ برنگ کے پھول اور پودینہ کی سبز پتیاں پانی میں تیرنے لگیں۔ شلجم چقندر اور بیگن ڈوب گئے احسن ایک چٹان پر بیٹھا دیکھ رہا تھا فیروزہ کے گرتے ہی وہ بے تاب ہوگیا مدد کو دوڑا اور ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔

صبح کا وقت تھا جنگل اور دریا خاموش اور چند پرندوں یا آبی جانوروں کے سوا ان چار آنکھوں کا تماشا کسی اور آنکھ نے نہ دیکھا۔ احسن بہتے ہوئے پھول پکڑ پکڑ کر لایا ڈوبی ہوئی ترکاریاں ٹٹول ٹٹول کر نکالیں اور وہیں کھڑے کھڑے ڈالی سجائی۔ فیروزہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ محسن کا شکریہ ادا کرے مگر بہت طاقتیں ایسی غالب تھیں کہ وہ کہہ تو کچھ نہ سکی مگر اتنا ضرور سکی کہ چلتے وقت اس کی آنکھوں نے مسکرا کر احسن کو دیکھا اور اس مسکراہٹ میں بہت کچھ پنہاں تھا۔

(۸)

دریا کی لہریں جنہوں نے فیروزہ کے گرنے پر قہقہے لگائے خاموش تھیں اس صبح کو جب درد دل سے ناآشنا حسینہ خاموش کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور احسن کی صورت نظر نہ آتی تھی آج اس کو معلوم ہو گیا کہ دل جن گتھیوں کو سلجھا رہا تھا جذبات جن سانپوں سے کھیل رہے تھے اور خواہشیں جس تخیل میں ڈوب رہی تھیں اس کی حقیقت کیا ہے اور احسن کا انتظار اور ناکامی یہ معنی رکھتا ہے کہ

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اسی حالت میں یار گئی اور مارا مار واپس آئی تو پھر ستاٹا تھا۔ دیر تک کھڑی رہی مایوس ہوئی تو باغ پہنچی دن تڑپ تڑپ کر اور رات کروٹیں لے لے کر ختم کی۔ ابھی آفتاب طلوع ہی ہوا تھا کہ باہر نکلی پھول توڑے ترکاری اکٹھی کی اور ڈالی سجا کر دریا پر آئی۔

(۹)

پرندوں کا نغمہ فضائے آسمانی میں گونج رہا تھا۔ جمنا رات کی نیند ختم کر چکی تھی اور لہریں چاندی میں ڈھلی ہوئی بہ رہی تھیں کہ فیروزہ کی منتظر آنکھوں نے احسن کی صورت دیکھی مگر انتظار و اشتیاق غصہ سے بدلا اس کی رسیلی آنکھوں میں بلوچی حرارت پیدا ہو گئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے اور اس نے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔

آج پہلا روز تھا کہ احسن اس کے قریب پہنچا ہر چند ہمت کی کہ اس کے قدموں کو ہاتھ لگائے اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ملے مگر یہ تمام جذبات جو رفتار کے ساتھ ترقی کر رہے تھے قریب پہنچتے ہی

فنا ہو گئے اور اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اس کے سوا کچھ کہہ سکتا۔

کل پاؤں کا درد زنجیر بنکر پاؤں میں پڑ گیا

فیروزہ نے یہ الفاظ خاموشی سے سُنے اور اتنا کہہ کر پانی میں اُتر گئی۔
"میں تو اس باپ کی بیٹی ہوں جو صرف ایک پاؤں سے دنیا کا مقابلہ کر رہا ہے"

(۱۰)

"اس سے پہلے کہ میں آپ کی درخواست کا جواب دوں میں آپ کی اس جھونپڑی میں تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، افسوس ہے کہ اس گھاس پھوس کے سوا یہاں آپ کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں۔ میں نے آپ کا ارشاد سُنا اس کے جواب میں عرض ہے کہ آپ مجھکو اس خیال سے نہ دیکھئے جو جھوٹی شرافت فانی دولت اور لغو امارت نے آپ کے دماغ میں پیدا کیا۔ میں بہادر جری قوم بلوچ کا ایک فرد ہوں لیکن میں ہندوستان میں بھیک مانگنے نہیں آیا گھوڑوں کی تجارت کے واسطے آیا۔ میری بیوی میرے ساتھ تھی گھوڑے سے گر کر میری ٹانگ ٹوٹی لیکن وطن کی واپسی میں یہ حارج نہ تھی فیروزہ میری پیاری بچی یہیں پیدا ہوئی مگر میری واپسی وطن میں اس کا وجود بھی رخنہ انداز نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے جس چیز نے ہندوستان میں روکا وہ اس فیروزہ کی ماں اور میری عزیز بیوی کی یہ سامنے والی قبر ہے جس کی میں پرستش کر رہا ہوں میں اس باغ اور باغیچہ کا رکھوالا نہیں ہیں ان ہڈیوں کی نگہبانی کر رہا ہوں جن کی عصمت کا میں مالک تھا۔ ہم بہادر جنگ جو ہیں۔ لیکن دغا باز نہیں تم دولتمند لوگ تم ہندوستان کے مسلمان تم رئیس و امیر ہمارے مقابلہ میں کوئی وقعت نہ

نہیں رکھتے۔ تم نے عورت کی مٹی پلید کی اور اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کے خیال سے انسانیت لرزتی ہے تمہارا ایمان یہ ہے کہ جھوٹے وعدوں اور غلط امیدوں سے ایک معصوم عورت کو نکاح میں لاؤ اور جب تمہاری بدولت تمہارے مظالم کے طفیل وہ تمہارے کچھ بچوں کو دودھ پلا کر یا افکار میں گھل گھلا کر صورت سے بے صورت ہو جائے تو تم اس کو ادھر میں چھوڑ دو سری عصمت کو تاکو اور اسلام کی آڑ میں مزے اڑاؤ مجھے معلوم ہے کہ خود آنجناب کی تین بیویاں موجود ہیں آپ کو حق نہیں کہ کسی معقول آدمی سے اس قسم کی درخواست کریں، مجھے معاف کیجئے، میری رائے میں آپ سے زیادہ جفا شعار مشکل سے ہوگا افسوس یہ ہے کہ آپ کے ان افعال پر آپ کی سوسائٹی یا برادری آپکا کنبہ یا قوم خوش ہے اور اس لئے وہ بھی آپ سے کم سنگدل نہیں ضرورت تھی کہ مسلمان آپ کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے۔ اور اگر ان میں ایمان ہوتا تو آپ کی صورت نہ دیکھتے آپ سڑکوں کے قریب جنگل کے وسط میں باغوں کے مابین نہروں کے کنارے ہماری خانہ بدوش قوم کی ہم فقیروں کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں میں جہاں عصمت کے جواہرات جگمگاتے ہیں اس صنف نازک کے وہ قدردان دیکھیں گے جن پر آسمانی فرشتے مرحبا کہتے ہیں ہم نے اس پھول کی جو عورت کی حیثیت میں قدرت نے ہم کو عطا کیا سچی قدر کی اور سر آنکھوں پر رکھا۔ ہمارے پھٹے ہوئے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی

جھونپڑیوں میں مسرت کے وہ خزانے دمک رہے ہیں جن کا عشرِ عشیر بھی تمہارے قالینوں اور غالیچوں محلوں اور دو محلوں میں موجود نہیں۔

کثرت ازدواج کے مسئلہ کو ہم تم سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ گو میں حافظ نہیں مگر آپ سے اور آپ کی تمام جماعت سے جو آپ کے ہمراہ ہے بہتر اور زیادہ قرآن اور حدیث مجھے یاد ہے لیکن آپ نے تو اس سلسلہ میں اسلام کو اُلٹی چھری سے ذبح کیا۔ نص کے خلاف میں کیا کوئی مسلمان نہیں جا سکتا مگر فروعات میں ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہر ضرورت خواہ وہ کسی عنوان کے تحت میں ہو، حالات کے اعتبار سے مکمل ہونی چاہیئے۔ شکم پری جس کی ضد خودکشی ہوگی انسان کی بہترین عبادت ہے اس کی تکمیل کسی وقت جنگلی پھلوں پہاڑی جانوروں سے ہو رہی تھی مگر آج گو مقصود وہی ہے لیکن حالات نے سامان بدل دیا اور غذا بالکل مختلف ہو گئی میں پھر کہتا ہوں کہ نص کی مخالفت کفر ہے لیکن نص کو دھوکا دینا کفر سے بھی زیادہ ہے قرون اولیٰ کی ضرورتیں اور تھیں اس وقت کے حالات اور تھے میں نے آپ حضرات کو اور بالخصوص آنجناب کو کبھی سر منڈاتے ہوئے تہمد باندھے ہوئے کھجوروں سے پیٹ بھرتے ہوئے اور پتھر ڈھونڈتے ہوئے نہیں دیکھا ہاں آپ کے نکاحوں کی خبریں میرے کانوں میں برابر پہنچتی رہیں۔ آپ ہم کو اقوام جرائم پیشہ میں شمار کرتے ہیں

نگاہ گریبان میں منہ ڈالیئے اور فرمائیے آپ سے زیادہ عادی مجرم
کون ہو سکتا ہے کہ شب و روز آپ بدبخت عورت پر سوکنیں
لا رہے ہیں۔ آپ خوش ہیں۔ آپ کی ستمگر سوسائٹی آپ کی ہاں
میں ہاں ملا رہی ہے! اس باغ میں میری حیثیت محافظ کی ہے
کہ میں ان پھلوں کو اور میووں کو پرندوں اور جانوروں سے
محفوظ رکھوں یہی میرا رزق اور میری زندگی کا سہارا ہے
یہ سامنے دیکھئے میری غلیل اور گوپیا اسی مرض کی دوا ہیں مگر
شام کے وقت جب اندھیرے کی چادر اس چاردیواری پر
پھیلتی ہے اور قدرت آفتاب جہاں تاب کی رونق کو فنا کرتی ہے
اس وقت طوطے کا ایک جوڑا اس اونچی ٹہنی پر آکر بیٹھتا ہے
میری آنکھیں جب یہ دیکھتی ہیں کہ فضائے آزادی میں مٹھی بھر
پروں کا یہ جوڑا زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے۔ اور ہوا کے
جھونکے اس کی سچی محبت پر قربان ہو رہے ہیں تو میرے ہاتھ رک
جاتے ہیں میرا دل کانپ جاتا ہے اور اب شکے ایک دوسرا
سماں دکھائی دیتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ محبت کے انتہائی جذبہ سے
مغلوب ہو کر مادہ سے لپٹ گیا اس نے اپنا روشن چہرہ چمکدار
منہ مادہ کے پروں پر رکھ دیا۔ مادہ اس کے پاکیزہ جذبہ کے استقبال
کو آگے بڑھی منہ سے منہ ملایا اور ان کے گلوں سے موسیقی کی
وہ صدائیں بلند ہوئیں جن پر کائنات نثار ہو تو میرا گوپیا گر پڑتا ہے
غلیل ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور میں از سرتا پا ان کی محبت
میں محو ہو جاتا ہوں مجھکو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے والا سماں

آپ کے ایک اشارہ میں ختم ہوتا ہے۔ اور آپ کے ایک قہر میں دونوں دم توڑتے ہوتے نیچے آپڑتے ہیں!

دور ہوجائیے آپ میرے سامنے سے اس لئے کہ آپ کافر کہیں گے، چلے جائیے یہاں سے اس واسطے کہ مشرک فرمائیں گے آپ مجبور ہیں اور قطعاً محروم اس دولت سے جس سے میرا دل مالا مال ہے۔ میری زندگی اور زندگی کا نصب العین یہ ہے!!

اتنا کہہ کر بلوچ کھڑا ہوا بیوی کی قبر پر سجدہ میں گرا اس کی خاک آنکھوں پر رکھی اور کہا، "دنیا آپ کے واسطے پڑی ہوئی ہے بہتر سے بہتر اور امیر سے امیر اور حسین سے حسین لڑکیاں موجود ہیں مجھے معاف فرمائیے اور آیندہ ادھر کا رُخ نہ کیجئے گا۔"

(۱۱)

وہی جمنا کا کنارہ ہے اور صبح صادق کا سہانا وقت۔ فیروزہ اپنی ڈالی ہاتھ میں لئے خاموش کھڑی ہے۔ احسن کچھ کہہ رہا ہے اور آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں بہہ رہی ہیں۔ اپنی داستان ختم کرچکا تو فیروزہ مسکرائی اور کہا "میرے باپ نے جو کچھ کہا وہ تم لوگوں کو کتنا ہی ناگوار ہو لیکن اس کا حرف حرف صحیح تھا میں اس کی مرضی یا اجازت کے خلاف ہرگز نکاح کے واسطے تیار نہیں اس لئے تم کو اس سے قطعاً مایوس ہوجانا چاہیئے۔

تم نے اپنی محبت میرے سامنے پیش کی یہ میرا فرض انسانیت ہے کہ میں اس کا جواب محبت سے دوں اس لئے جس زبان سے یہ لفظ ادا ہورہے ہیں کہ میں اپنے باپ کی مرضی کے خلاف دنیا یا اجازت

کے بغیر نکاح نہ کروں گی اسی سے یہ وعدہ بھی کرتی ہوں کہ اگر تمہارا دل محبت کے اسی مرکز پر قائم رہا تو میں کسی دوسرے شخص سے بھی نکاح نہ کروں گی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میں نے باپ کے ارشاد کی بھی تعمیل کردی اور محبت کا بھی جواب دیدیا۔" اتنا کہہ کر فیروزہ اپنی ڈالی لئے آگے بڑھی اور احسن منہ تکتا رہ گیا۔

(۱۲)

آج صبح کے وقت بادشاہی باغ جہاں دو آدمیوں کے سوا کوئی نہ ہوتا تھا بیسیوں آدمیوں سے بھرا ہوا ہے کچھ پولیس کے لوگ ہیں کچھ ہسپتال کے اور زخمی فیروز ایک چارپائی پر اس طرح پڑا ہے کہ اس کے کپڑے خون میں تر بتر ہیں۔ کوتوال اور تھانہ دار اس کے اظہار لکھ رہے تھے کہ اس کی حالت بگڑی اور اس نے طیش میں آکر کوتوال سے کہا۔

"سوتے آدمی پر حملہ کرنا بہادر کا کام نہیں، ہمت تھی تو میرے سامنے آکر مقابلہ کیا ہوتا، چھری کا قریب قریب تمام حصہ میرے پیٹ میں گھسا اور رات تک خون بند نہیں ہوا مگر مجھے اپنی موت کی پروا نہیں قلق یہ ہے کہ اس وقت میری قوم کا کوئی بچہ تک موجود نہیں جس کو وصیت کرتا۔"

فیروز نے یہ کہہ کر اپنی بچی کو پاس بلایا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور تجھ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں دعا کرتا ہوں کہ خدا تجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں کے فریب سے محفوظ رکھے۔ افسوس ہے کہ بلوچ قوم کا کوئی متنفس

اس واقعہ سے باخبر نہیں جوان سپاہیوں کو کافی سزا دیتا۔ میں قدرت کے قانون اور فطرت نسوانی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ دنیا بہت جلد بے گناہ باپ کے قتل کو تیرے دل سے محو کر دے گی مگر مجھکو وصیت کرتا ہوں کہ لباس عروسی تیرے جسم پر اس وقت تک حرام ہے جب تک تو میرے خون کا بدلہ احسن سے نہ لے لے"

یہ کہہ کر فیروز نے کلمہ طیبہ پڑھا اور دنیا سے رخصت ہوا۔

(۱۳)

باپ کے دفن کے بعد فیروزہ باغ سے اٹھ کر برابر کے گاؤں میں چلی گئی۔ آٹھ دن میں گاڑھے کا تھان تیار کرتی اور منگل کو شہر میں جاکر بیچ آتی۔ شہر اور گاؤں میں دریا حائل تھا برسات کا موسم تھا دو پیسہ دیکر ناؤ میں بیٹھتی اور پار چلی جاتی اور دو پیسہ دیکر لوٹ آتی۔

احسن کی حالت روز بروز ردی ہورہی تھی اس نے اس کے عزیزوں اور مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا۔ ہر قسم کا لالچ دیا، مگر سب بے سود تھا اب احسن کے واسطے صرف یہ ایک صورت تھی کہ وہ تڑپ تڑپ کر ہفتہ گزارے اور منگل کو کنارے پر آجائے۔ کچھ روز اس طرح گذرے مگر اب بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ فیروزہ نے اس سے بات چیت ترک کردی وہ ہرچند سب کچھ کہتا مگر وہ جواب نہ دیتی مجبوراً احسن نے ایک ناؤ تیار کی اور اس امید پر ہر منگل کو دریا پر موجود رہا کہ شاید وہ وقت بھی

آ جائے جب فیروزہ کو پار پہنچانے میں میری تمام کوششیں ناکام ہو گئیں لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

(۱۴)

بارش نے شاہدرہ کے قرب وجوار میں قیامت بپا کر رکھی تھی جمنا پوری طغیانی پر تھی اور بیسیوں گاؤں اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے ریلوے لائن اکثر جگہ سے بیکار ہو گئی۔ پل نصف سے زیادہ پانی میں ڈوب گیا اور ہر طرف سے الامان والحفیظ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں خدا معلوم کتنے آدمی اور جانور دریا میں بہ گئے۔ گائیں بھینسیں بھیڑ بکریاں تنکوں کی طرح بہاؤ میں جا رہی تھیں ستمبر کی چھٹی تاریخ کی شام کو بارش ہو رہی تھی جس کے خوف سے ہزارہا بندگان خدا بھرے گھر چھوڑ چھاڑ جنگلوں میں بھاگ گئے جمنا کے دونوں پاٹ ایک ہو گئے تھے اور پانی پل کے اوپر بہ رہا تھا۔

بادل گرج رہا تھا، بجلی چمک رہی تھی اور بارش لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی احسن ایک درخت کے نیچے خاموش بیٹھا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کے کان میں یہ آواز پہنچی۔

"احسن کیا تم مجھکو پار پہنچا سکتے ہو؟"

اس آواز نے احسن کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو فیروزہ بناؤ سنگار کئے سامنے کھڑی ہے۔ یہ پہلا روز تھا کہ احسن نے فیروزہ کو آراستہ دیکھا وہ قریب پہنچا اور کہا۔

"مجھے تعمیل میں عذر نہیں، ناؤ موجود ہے مگر اسوقت دریا میں قدم رکھنا موت کے منہ میں جانا ہے"

"ہاں میں بھی جانتی ہوں مگر میں نے تھان کا وعدہ آج ہی کا کیا ہے"
احسن ایک تھان کے بدلے ہزار اور لاکھ تھانوں کی قیمت قربان کرنے کو حاضر ہوں مگر اس وقت پار جانا مصلحت نہیں۔
فیروزہ۔ مجھے آپ سے قیمت لینے کا کوئی حق نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں اور پورا کروں گی"
احسن۔ اگر یہ حالت ہے تو میں قربان ہونے کو اور تعمیل کرنے کو تیار ہوں۔
فیروزہ۔ بسم اللہ
فیروزہ ناؤ میں بیٹھ گئی۔ احسن نے رسے کھولے۔ ناؤ کھینی شروع کی۔ پانی غضب ڈھا رہا تھا آناً فاناً ناؤ بھنور میں پہنچکر ہچکولے کھانے لگی۔ احسن کے ہاتھ سے بلیاں چھوٹ گئیں وہ فیروزہ کے قریب آیا اور کہا "بس ناؤ ڈوب رہی ہے" فیروزہ مسکرائی۔ اُس نے گلاب کا ایک پھول احسن کے سر پر رکھا اور کہا "یہ وہ رسم ہے جو بلوچوں میں نکاح کے وقت دولہن کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری محبت کے جواب میں میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اب موت سر پر ہے۔ میں نے باپ کی وصیت بھی پوری کر دی۔ احسن اس بھنور میں ہمارا نکاح ہے"
یہ کہہ کر فیروزہ نے اپنے ہاتھ احسن کے گلے میں ڈال دیئے اور ناؤ جمنا میں ڈوب گئی۔

۱۹۲۶ء

فتاة تنوير

تمہید

بھلے گھوڑے کو ایک چابک اور بھلے آدمی کو ایک بات! مانا کہ سلطنت ہمارے پاس سے جاکر ٹوٹا سا مکان اور وہ بھی محدود، حکومت کا خاتمہ ہوکر پانچ چار انسان اور وہ بھی کمزور رہ گئے، مگر مردہ رگوں میں ہاشمی خون ابتک دوڑ رہا ہے، اور اگر اس ڈھانچے میں جو صرف ہڈیوں کی مالا ہے جوش آگیا تو اچھے اچھے پہلوانوں کے ہوش کھو دے گا۔ لیکن خدا کی شان ڈیلی کرانیکل کا نامہ نگار۔ مذہب سے غیر، قوم سے غیر، عقائد سے غیر، ملک سے غیر، شکل وصورت سے جدا، عادت وخصلت میں جدا، رنگ وروغن میں جدا، طرز تمدن میں جدا۔ کھلے بندوں بھرے ہندوستان میں علی الاعلان یہ کہہ جائے۔ کہ اس سرے سے اس سرے تک کیا ہندو اور کیا مسلمان تمام ہندوستان میں اگر عزت وقعت کی چیز ہے تو صرف گائے ورنہ جوان ہو یا بڑھیا کھیلنے کی گڑیا اور دل لگی کی پڑیا ہے جس کے چہرے پر جب تک چار چلو خون سے مرد کا دل بہالائے اور روٹی کھائے اور ہم خون کے سے گھونٹ پی کر چپکے ہو جائیں مگر اپنی ٹانگ کھولیں اور آپ لاجوں مریں۔ نامہ نگار نے جو کچھ کہا ٹھیک اور حق الامر یہ ہے جو کچھ کتنا ٹھیک کہتا فسانہ تنویر کا ایک ایک حرف سات سمندر پار بسنے والے نامہ نگار کی تصدیق کر

ہے اور گو یہ داستان مردوں کے مظالم کا ادنیٰ نمونہ ہے مگر مغرب
آنکھیں کھول کر دیکھے کہ پردے کی بیٹھنے والیاں جن کے دامنوں پر
حوریں نماز پڑھیں کس طرح اپنی عصمت پر قربان ہوتی ہیں اسلام
کی وہ سچی تعلیم جو آج بھی وحشیوں کو انسان بنا دے گی ان کی گھٹیوں
میں پڑی ہوتی ہے اور یہ اس دودھ سے ہیں جس کا ایک قطرہ تمام
یورپ کی شرافت کا مول ہے، مرحبا سرزمین ہندوستان تیری
خاک سے وہ بچیاں پیدا ہوئیں جن کی زندگی ایک عالم کو عورت
کے معنی بتا گئی! زہے تقدیر شرقی قبرستانو!! تمہارے کھنڈر اس
دولت سے مالا مال ہیں جس کی مثال دوسری سمت نہیں ملتی اور
خوشا نصیب ٹوٹی پھوٹی دیواروں تم میں وہ گوہر نایاب موجود ہیں
جن کی آب وتاب اپنا جواب نہیں رکھتی! تعجب ہوتا ہے کہ کھونسے
میں پلنے والی بیگم جس نے آنکھ کھول کر نازو نعم کے سوا کچھ نہ دیکھا
محبت کے ظلم وستم اس طرح اُٹھائے اور اُف نہ کرے،

مسئلہ تقدیر سے انکار نہیں، مگر یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ تنویر لاکھ
تنکر چکی تھی۔ مگر بیچاری بیگم تھی جھوٹوں اشارہ کر دیتی تو فریدوں پور اور اس
کی بیس ہزار آبادی جان لڑا دیتی۔ مگر ان کمبختوں کو مردے بدبختی آنا
نصیب نہ ہوا۔ ورنہ وہ اس دل گردے کے لوگ تھے کہ بات کی
بات پر خون کی ندیاں بہا دیں۔ فریدوں قدر کی شرافت نجابت حسب
نسب جیسی بھی تھی خوب اور بہت خوب تھی، مگر افسوس اس سیدانی
کا لال ہو کر جس کی چوکھٹ پر بڑے بڑے پرہیزگاروں نے پیشانیاں
رگڑیں ایسا بدبخت نکلا کہ سادات کی ناک جڑ سے کاٹ دی! اور

جس تنویر کی پالکی اٹھوانے کا یہ خیال تھا کہ پورے چھ سال سیدوں نے ناکیں رگڑیں اس کی وہ مٹی پلید ہوئی کہ الامان الحفیظ، مگر عزت ازلی رفیق، خوشامدی قدیمی شفیق، مفت کی دولت لگی ہاتھ اچاوں کا ہوا ساتھ جو کچھ ہوتا کم تھا، بہرحال مدتیں ہوئیں یا برسوں گذرے یہ تو آج کہنا پڑیگا کہ تنویر تمام خاندان کی لاج رکھ گئی، اور امید ہے کہ جس طرح وہ دنیا سے ترستی پھڑکتی اٹھی عاقبت میں آسے راحت ابدی نصیب ہوگی ۔

گو دور عزیزی کی دیکھنے والی آنکھیں ایک ساٹھ ستر ہی برس کے الٹ پھیر میں ہمیشہ کو بند ہوگئیں مگر بنارس کے مقبرے، دلی کے کھنڈر، اکبرآباد کی مسجد، تنویر جہاں کے باپ نواب عزیزالدین خاں کی یاد اب تک تازہ کررہے ہیں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب وہ خاندان جن کے دروازوں پر ہاتھی جھومتے تھے دو دو دانوں کو محتاج ہوگئے تو گو سلطنت عباسیہ کا یہ آخری تاجدار بھی تاراج ہوگیا مگر ریاست کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور اس گئے گذرے زمانہ میں بھی اس کی حکومت کا ڈنکا تین سا ڑھے تین سو کوس تک بجتا تھا چار برس کے قریب لشتم پشتم گذر گئے مگر ۱۸۶۱ء کے بعد ضعیفی وانحطاط نے عزیز کو اس قابل نہ رکھا کہ وہ ان تعلقات میں پھنسا رہتا۔ لیعہد ریاست یا وارث جائز سے دیگر جو کچھ تھی تنویر، گو بعض نے مخالفت کی مگر عزیز یہ سوچ کر کہ جیتے جی اور مرے پیچھے یہی ریاست کی مالک ہے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہوگیا ۔

جشن تنویری

چاہیئے کہ تنویر ریاست کی مالک بنتے ہی کھل کھیلتی اور کوارے پنے کی قید، ماں باپ کی سختی، عزیزو اقارب کی نگہداشت سب سے آزاد ہوتے ہی رنگ لے آتی، مگر اس کا دل تو کچھ ایسا مرا تھا کہ کوئی امنگ ہی پیدا نہ ہوتی حتٰی کہ اس کا بس چلتا تو کورا ہی ٹالتی مگر کچھ رشتہ داروں کے طعنے کچھ کارکنوں کی صلاح اور سب سے بڑھ باپ کا اصرار چار و ناچار جشن منانا پڑا۔

اس جشن کے حالات میں ابونعیم اس زمانہ کا مشہور مورخ اس طرح لکھتا ہے۔

جشن تنویری اس دہوم دھام سے منا کہ تنویر کا نام ہوگیا۔ آدہی رات کے قریب قصر تنویر روشنی سے جگمگا رہا تھا چاروں طرف سے "ملکۂ ما شاد باش" کے نعرے لگ رہے تھے، تنویر سادہ لباس میں جلوہ افروز ہوئی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ خلقت نے بے نقاب دیکھا، دھانی لباس زیب تن تھا اور سیاہ بال کمر تک لہرا رہے تھے، زیور مطلق نہ تھا صرف دو ہیرے سرگوشیاں اور ایک الماس کی انگشتری زیب دو بالا کر رہی تھی، پندرہواں سال ختم تھا، اور نگارستان حسن کی کوئی ادا ایسی نہ تھی جو اس کے پاؤں میں نہ لوٹ رہی ہو۔ شباب کا فن آزادی کے دن، بھولی صورت گوری رنگت، حسن کی کان ملاحت کی جان، نزاکت کا مخزن ملاحت کی معدن تنویر قدرت کا کرشمہ اور

صنعت کا نمونہ تھی، آئی اور اس انداز سے آئی کہ سینکڑوں دل کچلے، چلی اور اس رفتار سے چلی کہ اراکین دربار کلیجہ مسوس کر رہ گئے، بیٹھی اور اس شان سے بیٹھی کہ بڑے بڑوں کے ایمان ڈانواں ڈول ہو گئے۔ چشم سیاہ ایک جادو تھی کہ جدھر اٹھی قیامت اور نگہ ناز ایک تیر تھا کہ جدھر پڑ آ آفت، اہلکار و خدام آداب شاہی ہیں رہے مگر حقیقی چچا زاد بھائی ثریا قدر پر ایسی بجلی گری کہ خاک سیاہ کر دیا۔ نذر دکھانے کو دکھا دی مگر پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، چہرہ کا رنگ فق اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے زبان بند، دیوانوں کی حالت، سودائیوں کی کیفیت، گرتا پڑتا اٹھا اور نذر دکھائی اور بیٹھ گیا

تنویر، یہ صحیح کمسن، بھولی، ناواقف، ناتجربہ کار سب ہی کچھ تھی مگر صورت دیکھتے ہی تاڑ گئی کہ ثریا ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ مرتے کو مارے شاہ مدار ظالم اچھی طرح سمجھ بوجھ کر کہ یہ تیر کلیجہ کے پار پہنچا پاس آئی اور کچھ اس طرح مزاج پوچھا کہ رہا سہا صبر و قرار لوٹ مار چلتی ہوئی، دربار ختم ہوا مگر اسکی یادگار ثریا کے کلیجہ پر ایسا داغ تھی کہ چار ہی دن میں برسوں کا بیمار معلوم ہونے لگا، دیوانہ وار پھرتا اور تنویر کی صورت نظر نہ آتی، بیقرار رہتا اور اس تک رسائی نہ ہوتی وہ تھا اور قصر تنویری کے چکر، ہرچند کوشش کرتا کہ اس خیال کو دل سے بھلا دوں مگر ایک ہوک تھی رہ رہ کر اٹھتی۔ دن کی بھوک رات کی نیند سب غارت ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کھانا پینا قسم اور ہنسنا بولنا حرام

تنویر کے رئیس ہونے میں کلام نہیں، مگر ثریا بھی کسی کا غلام

نہ تھا، وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی تو یہ بھی چھوٹے باپ کا بیٹا نہ تھا ایک
ہڈی ایک خون ایک گوشت، ایک پوست چرچا تو سارے شہر
ہی میں ہو رہا تھا، ثریا کا باپ لڑکے کا دیکھا یہ رنگ دات دیکھتا
وہ ڈھنگ غریب دنگ رہ گیا آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مشورہ نہ صلاح چپکا
اُٹھ بھائی کے ہاں نکاح کا پیغام دے دیا۔

تنویر جو کچھ بھی تھی خدا نہ تھی اور ثریا جیسا کچھ بھی تھا ایک ایک
گذرا نہ تھا کہ عزیز نکاح کے نام سے آگ بگولہ ہو جاتا اور اُلٹی سیدھی
سُنائیں کہ غریب اپنا سا منہ لے سیدھا اُٹھ چپکا چلا آیا۔

نکاح

عزیز الدین بارہ مہینے کا بیمار سدا کا روگی تھا بہت کمزور تھا، نکاح کا پیغام
اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا، بخار کھانسی، نزلہ، زکام، مشغولی
کا مرض بڑھاپا یہ سب کچھ تو پہلے ہی سے تھا اختلاج قلب
اور بڑھ گیا، اور حکیموں نے تبدیل آب و ہوا کی صلاح دی اور
دونوں باپ بیٹیاں چند روز کے واسطے دریا پار حسنپور چلے گئے۔

حسنپور والے تنویر یہاں کے رعیت نہ تھے مگر اس کی آؤ
بھگت میں کمی نہ کی، دل کھول کر دعوتیں کیں اور پیٹ بھر کر روپیہ
لٹائے،

ایک روز شام کے وقت جب تنویر بھی باپ کے پاس بیٹھی
تھی فریدوں قدر ایک کروڑ پتی تاجر کا لڑکا جو خود بھی مشہور وکیل
تھا ملنے آیا ہر ہر چند باپ نے اس کی وجاہت ثروت اور عزت

کا خصوصیت سے ذکر کیا مگر تنویر کو نقاب ڈالے ہوئے تھی مطلق متوجہ نہ ہوئی فریدوں قدر کو تنویر کی تمکنت ناگوار تو بہت معلوم ہوئی۔ اور ہونی چاہئے بھی تھی مگر پھر بھی اس نے یہ سلسلہ قائم رکھا کہ جب دوسرے تیسرے فرصت ہوتی، آتا تھوڑی دیر بیٹھتا اور چلا جاتا،

دو ڈھائی مہینہ اس طرح گذرے ہوں گے کہ عزیز کی بیماری نے نئی کروٹ لی جس کا انجام موت ہوا اور جس نے تنویر کو ہمیشہ کے واسطے باپ سے جدا کر دیا، عزیز کو مرے ہوئے دوسرا روز تھا کہ تنویر کے پاس یہ خط پہنچا۔

بیگم خدا آپ کی عمر دراز کرے۔

نواب صاحب مرحوم کی موت پر آپ کو جسقدر صدمہ ہو کم ہے مگر دنیا کا دستور یہی رہا ہے اور رہے گا پھر بھی خدا کا شکر کیجئے کہ آپ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ما دولت، حکومت، صورت، عزت، آسائش کا تمام سامان موجود اور مجھ جیسے کفش بردار خدمت کو حاضر، یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی تمام ریاست میرے پاس اٹھارہ لاکھ میں رہن ہے جس کی میعاد پوری ہو چکی اور اسی لئے مرحوم نے میری درخواست منظور کر لی تھی کہ مجھے اپنی غلامی میں لے لیں۔ بیگم آپ قرضہ کا خیال مطلق نہ فرمائیے روپیہ بھی آپ کا ریاست بھی آپ کی میں تو ایک خادم ہوں جو تا دم حیات نمک ادا کرتا رہوں گا۔

اس خط کو دیکھتے ہی تنویر کے چھکے چھوٹ گئے، ماں غذاٹ پر غور کرتی
تھی تو کہیں رہن کا بیان نہیں، باپ پر خیال کرتی تھی، تو کبھی اشارۃً کنایۃً
ذکر تک نہ کیا، بہتیرا سوچتی تھی، مگر قیاس کام نہیں کرتا تھا، کہ اس
علت کی اصلیت ہے کیا، فریدوں قدر زمانہ کا چلتا ہوا گھاگ اس نے
وہ جال بچھایا کہ تنویر سے نہ اٹھا سکے، بڑی بڑی کٹنیاں جو اپنے فن میں
طاق اور کام میں لاجواب تھیں ماماؤں اور نوکروں کے بھیس میں چھوڑ دیں
جن کی چکنی چپڑی باتوں نے تنویر کو شیشے میں اتار لیا، اب قرض کے یقین
کرنے میں کیا تامل تھا، اور یقین کا نتیجہ رضامندی، نکاح ظاہر تھا
دھوم دھام سے ہوا، یا چپ چپاتے، مختصر یہ کہ تنویر جہاں بیگم فریدوں قدر
کے نکاح میں پہنچ گئیں اور عقد کے بعد سب سے پہلا کام اس دستاویز
کی تکمیل تھی، جس میں یہ وعدہ تھا کہ اٹھارہ لاکھ روپیہ جو میرے ذمے
واجب الادا ہے۔ بہ تدریج ادا کرتی رہوں گی۔

فریب

جس دغابازی اور عیاری، چالبازی اور مکاری سے فریدوں
قدر نے ایک بھولی بھالی عورت کی آزادی سلب کی ہے، وہ تمام
فریدوں پور کے مرجانے کا مقام ہے۔ بے ایمانی کا تو علاج نہیں، مگر
سچ یہ ہے کہ آج بھی پشتیں گذر گئیں اسی کی معافی اور گذارے کی بدولت
اور اسی کی جوتیوں کا صدقہ گھر بیٹھے راج کر رہے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ نکاح کے بعد تنویر کو پھر گھر جانا نصیب نہ ہوا
بہتیرا اتری پڑی، ہر چند لوٹی پیٹی، مگر پھنسی ایسے ظالم کے جال اور مکار کے

پھندے میں تھی کہ پورے پانچ سال متواتر رنج والم کے پہاڑ ٹوٹے اور
دم بھر کو رہائی میسر نہ ہوئی۔ بدبخت فریدوں خدا جانے کس سخت
دل کا انسان تھا کہ نکاح کے پہلے ہی سال قیدیوں کی طرح گھر میں
ڈال تمام مال جائداد پر قابض ہو گیا۔

تنویر اب تین بچوں کی ماں تھی، مگر کیسی ماں، جس کو اپنی آمدنی کی
خبر نہ شوہر کی کمائی سے واسطہ، نہ کسی معاملہ میں دخل دینے کا حکم،
نہ کسی بات میں بول سکنے کی مجال، گھر کا تمام انتظام روپیہ پیسہ حساب
کتاب سب فریدوں کے ہاتھ میں تھا۔ مہربان ہوا بیوی سے بات کر لی
ورنہ رات کو گیارہ بجے آنا، اور سو رہنا، اللہ اللہ جس بیگم کے آگے ایک
چھوڑ پانچ پانچ چھ چھ مامائیں آنکھیں بچھاتی تھیں اب اس کی یہ گت
تھی کہ عالی شان محل سرائے میں بچوں کے لئے اکیلی پڑی رہتی اور
کوئی بات تک کرنے والا نہ ہوتا، جن ہاتھوں نے روپے اور اشرفیاں
لٹائیں اب وہ ایک ایک کوڑی کو محتاج تھے، مردہ دل تو پہلے ہی تھی
ادھر ماں باپ ادھر آئی مصیبت سمند ناز پہ تازیانہ ہو گیا جنازہ دولہا
کا تشریف لانا، جس کے حُسن کی دور دور دھاک تھی چار ہی دن میں خاک
میں مل گئی فریدوں ڈھونڈتا تھا چٹک مٹک، تنویر ماں باپ کی بیٹی دبی
دبائی بچوں کی پرورش نے سارا حُسن گھال دیا۔ میاں کی بے اعتنائی
نے مزاج میں ایسی لاپرواہی کر دی کہ آٹھ آٹھ دن سر گوندھنا قسم ہو جاتا
جس جسم پر کبھی چکن اور بنارسی گلبدن پھٹا پڑتا تھا، اب اس پر
بلا ململ کرتے اور میلے کچیلے دوپٹے تھے، ایک قیامت خیز
مصیبت یہ تھی کہ فریدوں کی پھوپی زاد بہن بچپن کی منگیتر صورت شکل

کی اچھی اس وقت تک کنواری بیٹھی تھی، اور ماباپ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح فریدوں کے سر چپکیں انکار تو فریدوں کو بھی نہ تھا مگر مطلب یہ تھا، کہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آوے ان بیچاروں کو کیا عذر تھا، نتیجہ یہ کہ میاں فریدوں دوسرا نکاح کرکے داخل ثواب ہو گئے۔

اس نکاح کی بڑی شرط تنویر جہاں کے طلاق کی تھی، اور سنگ دل فریدوں منتظر تھا اس وقت کا کہ مظلوم تنویر پر کوئی الزام لگا کر نکال باہر کرے۔

محبت کے ایام ابتدائی کی ہمراز ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی جو دلہن کی طرف سے دولہا کو پیش کی گئی، اور اب کہ تنویر ہر طرف سے مایوس تھی وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہی تھی کہ اس کی نشانی فریدوں کے ہاتھ میں رہے گی مگر جب اتنی آس بھی نہ رہی اور ظالم نے وہ انگوٹھی نئی دولھن کو چڑھا دی تو تنویر کی رہی سہی اُمیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔

طلاق

جشن تنویری میں ثریا کے دل پر جو چرکا لگا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ آسانی سے بھر جاتا، عزیز نے جواب دیا کہ تنویر کی شادی ہو گئی وہ کسی طرح نہ بھولی، پہاڑ سی راتیں، ان جنگلوں میں ختم ہوئیں۔ جن میں دن دہاڑے جاتے آدمی کا پتہ پھٹتا، تارے اس کے سامنے کھیلتے، چاند اس کے سر پر دمکتا، چاندنی اس کی گود میں لوٹتی، پتے اس کے

اوپر گرتے، مگر کائنات میں کوئی شے ایسی نہ تھی۔ کہ اس کا غم غلط کرتی کامل پانچ سال اسی طرح خدائی خوار خاک چھانتا، مارا مارا پھرا۔ امید کا ہر شائبہ مفقود ہو چکا تھا، مگر منزل مقصود اس کے سامنے تھی اور وحشت دل شہر بہ شہر اور گلی گلی پھرا رہی تھی، ببول کے زرد پھول اور گلاب کی سرخ پنکھڑیاں، فاختہ کی کوکو، بلبل کا نالہ، کوئی چیز ایسی نہ تھی جو تنویر کی یاد تازہ نہ کرتی ہو، ایک روز کہ آفتاب غروب ہونے والا تھا، ثریا اس سرزمین پر پہنچا، جو حسن پور کے نام سے موسوم تھی اس کوچہ میں جا نکلا جہاں وہ بھولی صورت بستی تھی اس بارہ دری کے نیچے جا کھڑا ہوا جس کے اوپر تنویر کھڑی شفق کو دیکھ رہی تھی

تنویر و ثریا کا چار آنکھیں ہونا، کیسا نازک وقت ہوگا، آنکھ کے سامنے تھی وہ صورت جس کا اشتیاق دیدار ثریا کو چاروں طرف دیوانہ وار لئے پھرتا تھا۔ ڈوریئے کا میلا کرتہ گلے میں اور ململ کا پیازی دوپٹہ سر سے ڈھلک کر کاندھے پر مگر اس حالت میں بھی تنویر حسن کا کرشمہ تھی، محبت کا تاج اس کے سر پر لہلہا رہا تھا، ٹھنڈی ہوا پریشان بالوں کو چھیڑتی ہوئی کہہ رہی تھی،

نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی
جو بیٹھی ہے بگڑی تو گویا بنی

چشم سرمگیں اس وقت بھی جھجکی، اور قریب تھا کہ اوجھل ہو جائے مگر دل نے صدا دی، دیوانی جو صورت فریدوں کے ہاتھوں برباد ہوئی یہ اسی کا دیوانہ ہے، پانچ برس کی ترسی ہوئی آنکھیں سیراب ہو رہی ہیں۔ ان پر رحم کر اور کرم سے کام لے مگر نگاہ

اپنا کام کر چکی تھی، ثریا کو زیادہ دیر احسان نہ اٹھانا پڑا، اتنا زبان سے ضرور نکلا۔

ہائے تنویر جہاں!

اور غش کھا کے گر پڑا، کچھ نہ سہی عنایت، محبت، مروت، یگانگت تقاضائے انسانیت بھی تھا۔ حقیقی چچا زاد بھائی کوئی غیر نہیں، بچپن کے ساتھ کھیلے، کچھ بیر نہیں، ایک کا گھر، ایک کا پردیس، ایک ہوشیار، ایک بیہوش، سڑک کا معاملہ، بازار کی بات، اندھیرا گھپ، سر پر آدھی رات، کیسی خاطر اور کس کی مدارات، تنویر کے پہلو میں بھی دل تھا، پتھر نہ تھا، جس تنویری کا خیال ثریا کا استقلال، دونوں تصویریں آنکھ کے سامنے تھیں ایام گذشتہ کی یاد نے نازک کلیجہ پر پتھر برسا دیئے اور جذبۂ محبت دروازہ تک لے آیا، گھبرا کر پاس آئی اٹھوا کر اندر لائی، اور اب وہ وقت آگیا، کہ تنویر کی آنکھیں ثریا کی حالت پر آنسو گرا رہی تھیں اور نازک ہاتھ گلاب کے چھینٹے دے رہے تھے، تنویر کی کوشش، قانون قدرت یا ثمرۂ محبت جو کچھ بھی تھا، ثریا نے آنکھ کھولی اور دیکھا کہ جس آنکھ کا شیدا ہے، اس ہی محبت نے کوٹ کوٹ کر موتی بھر دیئے ہیں یا مہمان کی تواضع، بھائی کی خاطر، سچی محبت کا شکریہ جو چاہے سمجھ لو، تنویر پاس سے ہٹ کر اس طرح بولی۔

"کیسا مزاج ہے، کدھر آنکلے؟"

ثریا۔ زندگی، عذاب اور حالت خراب اس کا جواب ہے۔

تنویر۔ منہ ہاتھ دھوئیے کچھ کھاتا کھائیے۔

ثریا۔ بیگم فریدوں پور تم سے چھوٹ گیا، حسنپور کی آب وہوا نے تمکو کیا سے کیا بنا دیا، یقین کرو، کہ فریدوں پور کا ایک ایک ذرہ تمہارے

دیکھنے کا مشتاق اور تمام خاندان تمہاری جدائی پر رو رہا ہے، اگر تم اجازت دو تو میں نواب فریدوں قدر سے درخواست کروں۔

بہت مشکل ہے یہ کہنا کہ تنویر اس کا کیا جواب دیتی، ابھی ثریا کا فقرہ ختم نہ ہوا تھا، کہ فریدوں قدر یہ کہتا ہوا اندر گھسا،

"میں نے آپ کی بیگم کو کبھی نہیں روکا شوق سے لے جائیے"

اتنا کہا، اور اسباب بندھا صبح کے وقت ثریا اور تنویر دونوں کو حسن پور سے رخصت کیا۔ گاڑی نالہ سے پار ہوئی کہ سانڈنی سوار لپکا ہوا آیا اور تنویر جہاں بیگم کو ایک لفافہ دیا جس میں طلاقنامہ رکھا تھا۔

تنویر نکاح میں تھی تو کیا پتھر پڑے تھے کہ طلاق ہو کر مصیبت ٹوٹے گی مگر عمر بھر کی کمائی وہ تین لال تھے، جو فریدوں نے زبردستی رکھ لئے، اور جن کا خیال اس وقت بدنصیب تنویر کو آٹھ آٹھ آنسو رلا رہا ہے۔

وسط ہند کے مشہور پہاڑ ارتینیا کے لق و دق میدان میں دریائے حسن کے کنارے ایک خوبصورت بارہ دری کے پائیں باغ نے کوسوں ہوا کو معطر کر رکھا ہے طائران خوش الحان چہک چہک کر قدرت کے مزے لوٹ رہے ہیں، صبح صادق کا سہانا وقت ہے اور باد صبا پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی پھر رہی ہے۔ صاف شفاف پانی کوسوں بہتا چلا جا رہا ہے۔ آبشار گر رہے ہیں۔ کوئل نے پہاڑ سر پر اٹھا رکھا ہے، ایک نواڑ کی پلنگڑی پر ثریا قدر لیٹا ہے، اور گھاس کے سرسبز قطعہ پر تنویر ٹکٹکی لگائے بیٹھی ہے آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں بہ رہی ہیں اور اس طرح التجا کر رہی ہے۔

"تم نے مجھے دھوکہ دیا، اور میرے کلیجہ کے ٹکڑے ہمیشہ کو چھنوا دیئے

کنبہ میں میری ناک کٹی، دنیا میں میری خاک اڑی، خدا کا واسطہ مجھے چھوڑ دو میں تم سے اور تمہاری محبت سے باز آئی، جس نے مجھے برباد کیا، اسی کی ہوں، وہ جانے اس کا خدا جانے، مگر تم ایک ایسی عورت کو جو غیر کی ملکیت اور تمہارے پاس امانت تھی، فریدوں پور کے نام سے اس جنگل میں لائے، اور الفت کے پردہ میں دھوکہ دیا۔

ثریا۔ جو شخص تمہارے واسطے انسان سے جانور، زندہ سے مردہ اور صورت سے بے صورت ہوا، جو اس چاند سی صورت کا دیوانہ ہے وہ دھوکہ دے گا، تنویر رحم!

یہ اخبار آج ہی کا ہے اس کو پڑھو اور بتاؤ کہ فریدوں کی یاد کہاں تک درست ہے۔

[نواب فریدوں قدر کی بیوی تنویر جہاں بیگم، ثریا قدر کے ساتھ تین بچے چھوڑ کر بھاگ گئیں اور اس وجہ سے انہیں طلاق ملی۔]

تنویر۔ شاید تقدیر مجھے اس سے بھی زیادہ برا وقت دکھائے، مگر جب تک دم میں دم اور جان میں جان ہے مرے ہوئے باپ دادا کی آن میں فرق نہ آئے گا، میں ایسی ایسی خبروں کا یقین نہیں کرتی۔۔

یہ کہہ کر تنویر اٹھی، دل قابو میں نہ تھا، اور آنسو ابھی تک جاری تھے چشمہ کے کنارے پر پہنچی، گلاب کے پھول جھک جھک کر پانی کو چوم رہے تھے اور ہوا چاروں طرف اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھی، ٹھٹکی، کچھ سوچا، دفعتاً اس کا چہرہ جس پر رنج و حسرت کی گھٹا ئیں برس رہی تھیں خوشی سے بدل گیا، وہ ہنستی ہوئی لوٹی، اور ثریا قدر سے کہنے لگی:۔

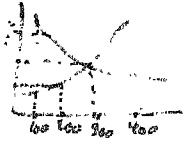
اچھا میری ضد تمہاری آزمائش تھی، محبت کی قدر تم سے

زیادہ کرتی ہوں، اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو آج فریدوں میرے پاؤں دھو دھو کر پیتا، جشنِ تنویری میں تمہاری نگاہ مجھ سے وہ عہد لے گئی جس کو میں نے حسن پور میں پورا کیا، اور اب تمہارے سامنے سُرخ رو کھڑی ہوں، آدمی کو حکم دو کہ پانی تیار کرے اور جس قدر ممکن ہو میرے کپڑوں کا انتظام کرو،

تنویر کی یہ گفتگو قوتِ کیمیائی یا کرشمۂ مسیحائی تھا، کہ مردہ اُچھل کر اُٹھ بیٹھا اور اہتمام میں مصروف ہوا فوراً مقفل دروازے کھول دیئے گئے۔ شام ہو چکی تھی پھول کھل چکے تھے اور محل سرا کی روشنی رات کو دن بنا رہی تھی،

تنویر جہاں نہادھو کر اس وقت کے واسطے تیار ہو چکی تھی جو ثریا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آج اس کا حسن قمر چہار دہم کو جو سر پر تھا شرمندہ کر رہا تھا ہوا اس کے بالوں کی بلائیں لے رہی تھی دفعتہً تنویر ایک مستانہ چال سے ٹہلتی ہوئی آئی اور ثریا سے یہ کہہ کر میں بالوں کے واسطے تھوڑے سے پھول توڑ لاؤں چمن میں آئی محافظ مطمئن ہو چکے تھے ثریا کے سر پر عشق کا جن سوار تھا باغ کے دروازے کھل چکے تھے چمن میں پہنچنے کے بعد تنویر کا پتہ نہ چلا کہ آسمان کھا گیا یا زمین، چاروں طرف اِدھر اُدھر لوگ دوڑ پڑے، کونہ کونہ اور چپہ چپہ ڈھونڈھ مارا مگر تنویر کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔

جب ثریا کی جھوٹی مسرت اس طرح مصیبت سے بدل گئی اور تنویر کے غائب ہونے نے اسکی تمام اُمیدوں کا خاتمہ کر دیا تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سر پر خاک اُڑاتا حسن پور روانہ ہوا۔



فراق ابدی

ارجنٹینا کے لق ودق میدانوں اور سنسان جنگلوں میں رات تنویر کے سر پر تھی اور یہ چوتھی کی دلہن جس کے پاؤں میں ہوا سر سرا سر سرا کر لوٹ رہی تھی منہ اُٹھائے چلی جاتی تھی، نازک دل دھکڑ دھکڑ اور کلیجہ بلیّوں اُچھل رہا تھا رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور شبنم کے قطرے اُس کے نازک رخساروں پر قربان ہو رہے تھے، فرش مخمل پر تکلف کرنے والے پاؤں ببول کے کانٹوں پر پڑ رہے تھے، شیروں کی دھاڑ، ہاتھیوں کی چنگھاڑ اژدہوں کی پھنکار کانوں کے پار ہو رہی تھی۔ بندر اور لنگور برابر سے نکل رہے تھے اولاد کی ترستی خانماں برباد بیگم اپنی دھن میں مست چلی جا رہی تھی یا آخر شب سیاہ نے آسمان کو کروٹ دی اور تارے جھلملانے شروع ہوئے، پو پھٹی، طائران خوش الحان شہسوار مشرق کے استقبال کو باہر آئے، اور تنویر نے تھوڑے فاصلہ پر آگ روشن دیکھی بدن اچور ٹانگیں شل، کمر خم اور پاؤں لہولہان تھے اسی سمت روانہ ہوئی قریب پہنچی ایک گاؤں دیکھا اور قصبہ کے رئیس کے ہاں نوکر رہنے سہنے لگی۔

ایک روز صبح کے وقت جب آدمی نے لاکر ڈاک دی اور تنویر اپنے آقا کے پاس لیکر چلی اس نے سب سے اوپر فریدوں کا خط دیکھا بے چین ہوگئی ہر چند چاہتی کہ گھر کی بیگم سے خیر و عافیت دریافت کرے مگر ڈرتی تھی کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے لیکن اپنی بیوی کو افسردہ دیکھ کر اتنا دریافت کیا کہ "بیگم آج آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں"۔

بیگم ۔ ہمارے ایک عزیز نواب فریدوں قدر ہیں جن کی کمبخت
بیوی تین بچے چھوڑ کر اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ بھاگ گئی آج ان کا خط
آیا ہے اُن کا چھوٹا بچہ مر گیا۔
مامتا کی ماری ماں اتنا سُنتے ہی کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئی جتنا ضبط کرتی تھی
اتنا ہی دل اُمڈ آتا تھا یوں تو ہر لمحہ اور ہر گھڑی بچوں کی تصویر اس کی آنکھ کے
سامنے تھی مگر اس خبر نے تنویر کو حواس باختہ کر دیا معصوم کا خیال ایک چھری
تھا جو جگر پر چل رہی تھی تین ساڑھے تین برس کا بچہ جو خون جگر پی کر بڑھا
پلتا تھا الٹا چھوڑ کر آئی ہمیشہ کو چھوٹ گیا اس مسافرت میں کہ جان و مال اور
عزت گئی مصیبت تھی اس کی رحلت خون بنکر گھسی۔ اور آنسو بنکر ٹپکی دیوانوں
کی طرح چاروں طرف پھرتی اور نام لے لے کر چیختی جنگل میں نکل جاتی گھنٹوں
روتی مگر مردہ دل کو تسکین نہ ہوتی اسی کرب و اضطراب میں چھ مہینے بسر کئے
آخر وحشت دل رنگ لائی اور ایک روز اسی پھول کی یاد میں جو بھری گود
خالی کر گیا، آدھی رات کے وقت باہر نکل کھڑی ہوئی سادات کا خون غیرت
کے مارے پاؤں نہ اُٹھنے دیتا تھا مگر مامتا لال کی خاک پر لئے جا رہی تھی اور
کہتا تھا اس قبر کے بوسے لوں جہاں کلیجہ کا ٹکڑا گہری نیند سو رہا ہے،
صورت میں زمین و آسمان کا فرق تھا، صورت بدل چکی تھی ایک پھٹی سی چادر
سر پر ڈالے اور ڈاڑھیں مارتی اسی طرف چلی پورے چار دن اسی طرح
خاک اُڑاتی فریدوں پور پہنچی آنکھ ناک۔ صورت شکل۔ چال ڈھال
وضع قطع عادت خصلت ہر چیز بچہ کی نذر ہو چکی تھی، ناخن بڑھے ہوئے،
بال الجھے ہوئے چہرہ مرجھایا ہوا ایک آٹھ ہی برس میں تنویر اس لائق ہو گئی
فریدوں پور کے بیس ہزار آدمیوں میں ایک متنفس نہ پہچان سکا قصہ تنویر کو

دیکھتی ہوئی جس پر اُلّو بول رہا تھا آگے بڑھی اب وہ قبرستان آنکھ کے سامنے تھا جہاں ہزاروں بندگانِ خدا آرام کر رہے تھے دوپہر کا وقت تھا۔ ہوا گرم تھی۔ املی کے تنا ور درخت کے نیچے ایک ٹوٹی سی قبر پر بیٹھی تو آنکھ نے اور ہی سماں دیکھا ایک تازہ پختہ قبر پر یہ کتبہ تھا۔

نواب فریدوں قدر کا منجھلا بچہ سلیمان قدر

ایک چیخ ماری اور یہ کہتی ہوئی قبر پر گری۔
"ہائے پیارے سلیمان تو بھی گیا"۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ہوش آیا قبر سے چمٹ گئی جا بجا بوسے لئے اِدھر اُدھر بلائیں لیں اور پھر لیٹ گئی آنسو ختم ہو چکے تھے مگر مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی ایک ہی صدمہ ایسا پڑا تھا کہ پنپنے کی اُمید نہ تھی اس پر یہ دوسرا داغ تنویر مصیبت کی سچی تصویر تھی تیسرے چوتھے روز آبادی میں آتی ٹکڑا ٹھیرا مانگ لیتی اور چلی جاتی یہ گرمی کے پہاڑ سے دن کہ چیل انڈا چھوڑے اس کے سر پر گذر جاتے ایک چھوڑ دو دو بچے اور کیسے بچے جو ماں کے عاشق زار تھے زمین کا پیوند ہو گئے یہ بچہ تنویر کی آٹھ سال کی کمائی تھی اور دم بھر ماں کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا یہ لال ایسا بچھڑا کہ دل قابو میں نہ رہا اس کے بدلے اس کی قبر دن رات کلیجے سے چمٹائے پڑی رہتی اہوش آتا تو کچھ اس درد سے فریاد کرتی کہ اولاد والوں کے کلیجے سن ہو تے!

ایک دن فاختہ دوپہر کے وقت بے ثباتی دنیا کا درس دے رہی تھی، اس کا جی بھر آیا اور اس وقت کو یاد کرنے لگی جب کلیجے کے ٹکڑے آنکھوں کے سامنے کھیلتے دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھی اور سوچتی کہ ایک

فریدوں قدر نے بیوفائی کی تو کیا یہ تین تین شوہر موجود ہیں ایک ایک روٹی دیں گے تو پیٹ بھر لوں گی۔

سچ پوچھو تو زندگی کا سہارا عمر کا گزارا اب جو کچھ بھی تھا تنویر کو یہ بچے تھے ورنہ فریدوں نے اپنی کرنے میں کسر نہ رکھی اور وہ تکلیفیں دیں کہ خدا دشمن کو نصیب نہ کرے۔ محلوں کی بیٹھنے والی بیگم نے در در کی بھیک مانگی خدا کی قدرت ہے کہ جس کے گھر میں پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا شہر در شہر اور گاؤں در گاؤں ننگے پاؤں ٹھوکریں کھاتی پھرے اور کوئی بات تک پوچھنے والا نہ ہو سال بھر کے قریب اسی طرح بسر ہوا کڑکڑاتے جاڑے جیٹھ بیساکھ کی گرمی ساون بھادوں کے طوفان اسے قبرستان میں قبر پر گزر گئے۔

ایک روز شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ نواب فریدوں قدر کا بڑا لڑکا سخت بیمار ہے اور دور دور سے حکیم و ڈاکٹر بلائے جا رہے ہیں۔ سنتے ہی جان نکل گئی۔ بہتیرا سنبھلی ہر چند ضبط کیا مگر نہ سنبھل سکی اسی حالت میں روتی پیٹتی حسن پور پہنچی پیہم صدمات کمر توڑ چکے تھے اور اب صورت اس قابل نہ رہی تھی کہ پہچانی جا سکے آنسو کا دریا بہ رہا تھا دل کے ٹکڑے اڑ رہے تھے اور کوئی صورت ایسی نظر نہ آتی تھی کہ پانچ برس کے چھوٹے ہوئے لال کی صورت دیکھ سکے آدھی سے زیادہ رات محل سرا کے نیچے بسر ہو گئی لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ کسی سے دریافت کر لے۔

صبح ہوتے جب دل کی بے چینی بڑھی تو دروازے کے قریب گئی داروغہ باہر نکل رہا تھا۔ روئی اور نوکری کی التجا کی۔ غرض ماں ممتا کی ماری ماما کی حیثیت میں بچہ کی تیمارداری پر رات کے واسطے تعینات

ہوئی بچہ تپ محرقہ میں مبتلا تھا اور تنویر دور سے بیٹھی حسرت سے اُس کا منہ تک رہی تھی جب نیند کا جادو تمام دنیا پر چل چکا فرید قدر اور اُس کی بیگم خواب گاہ میں گئے نوکر چاکر ڈھیر ہوئے کمرہ میں سناٹا چھایا تو صرف وہ آنکھ جاگ رہی تھی جس کی چودہ پندرہ برس کی کمائی لٹ رہی تھی پیشانی کو بوسہ دیا منہ پر ہاتھ پھیرا اور بے تاب ہو کر لپٹ گئی قریب تھا کہ ایک چیخ مارے مگر ضبط کیا اور الگ ہو بیٹھی، بن ماں کا بچہ ایک غیر عورت کی یہ شفقت دیکھ ماں کی گود یاد کر کے رو دیا۔ کیا حسرت انگیز وقت تھا دکھیاری لپٹ لپٹ کر بوسے اور جھپٹ جھپٹ کر دعائیں دے رہی تھی، مریض کے زیادہ اصرار پر اتنا کہا "بیٹا مجھ دکھیاری کی بپتا کلیجہ ہلا دے گی دو لال خاک میں جا سوئے ایک ہو بہو تیری صورت کا تھا جس کی یاد آج کلیجہ تڑپا رہی ہے" ماں بیٹوں کی گفتگو میں رات صبح ہو گئی ڈاکٹر آیا حرارت دو درجہ بڑھی ہوئی تھی غصہ سے کہا "بچہ جاگا ہی نہیں بلکہ واقعہ سے کام لیا بہتر ہے کہ کمرہ بند کرو اور آج بالکل تنہا چھوڑ دو" نزلہ بر عضو ضعیف تمام مصیبت اسی بیمار دار پر آئی اور تنویر فرید دل قدر کے حکم سے فوراً محلسرا سے باہر نکال دی گئی روتی پیٹتی باہر آئی دن بھر بارہ دری کے چکر کاٹے معاملہ اتنا نازک تھا کہ کچھ نہ پوچھ سکتی تھی مگر دل پر جو گذر رہی تھی وہ خدا ہی خوب جانتا تھا ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی کہ مجھے اندر پہنچا دو۔ بھوکی ہوں ٹہل کروں گی پیٹ بھروں گی مگر کس کے دل کو لگی تھی۔ اس کا نتیجا اُس کا اُن اُڑا دیا۔

آہی ماں منا کی مصیبت دشمن پر بھی نہ پڑے روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا شام کے وقت بلکتی ہوئی ڈاکٹر کے قدموں پر گری اور کہا۔

"ہمایوں کی کھلائی ہوں خدا کا واسطہ مجھ کو میرے بچہ تک پہنچادو"۔

ڈاکٹر صاحب اولاد تھا، ساتھ لے گیا گھر میں افراتفری مچی ہوئی تھی ایک بچہ کی علالت دوسرے کی پیدائش کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور تنویر بچہ کے کمرہ میں پہنچ گئی۔

جب شب سیاہ اپنا پورا قبضہ جما چکی اور لوگ اپنے اپنے بچھونوں پر پہنچے تو تنویر اُٹھی بچہ کے قدموں سے آنکھیں ملیں گو ڈاکٹر نے ممانعت کردی تھی مگر دل کی لگی دم بھر کو بھی خاموش نہ ہونے دیتی تھی اس نے آنکھ بند کی اس کی جان پر بنی وہ خاموش ہوا یہ پریشان ہوئی، کبھی سانس دیکھتی تھی، کبھی نبض، کبھی ہاتھ چومتی تھی، کبھی پاؤں چند گھنٹے کے مہمان پر دیوانہ وار صدقہ اور پروانہ وار قربان ہورہی تھی کلیجہ ان ہی داغوں سے چھلنی ہوچکا تھا اور اب تنویر اس قابل نہ تھی کہ ہمایوں جیسا بچہ جو ہزاروں منتوں اور ارمانوں سے جوان ہوا جس کے نام کی دیوانی اور صورت کی قربان تھی آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جائے اور وہ زندہ رہے مگر دنیا سب تماشے دکھا رہی تھی چھوٹے کی خبر سنائی منجھلے کی قبر دکھائی اور اب جوان شبیر آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا تین تین گھنٹہ بعد دوا دی جارہی تھی اور پانچ دن اور پانچ رات

کی بھوک پیاس سب کام اپنے ہاتھ سے کر رہی تھی ہوش و حواس جا چکے تھے سلنے کی دوا بھول میں پلا دی زہر کا حلق میں اترنا تھا کہ بچہ نے صرف اتنا کہا "ہائے ظالم سلنے کی دوا پلا دی" اور بیہوش ہوگیا۔ اس وقت کی حالت خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے دیواروں سے ٹکریں مارتی تھی اور تڑپتی تھی۔ آدھی رات کا گجر بج رہا تھا ہمایوں کا سانس اکھڑ گیا اسی حالت میں اس نے آنکھ کھولی اور دیکھا کہ سر ماں کی گود میں ہے۔ ہاتھ گلے میں ڈال دیئے اور اتنا کہہ کر پھر بیہوش ہوا۔

"میری بدنصیب ماں میری خطا معاف"

بچہ کا اتنا کہنا تھا، کہ تنویر کا دل بھر آیا، لپٹ گئی اور کہا۔

"میرے لال خطاوار میں ہوں"

تنویر بچہ کو لئے بیٹھی تھی کہ اس نے پھر آنکھ کھولی زبان بند ہو چکی تھی ماں کے آگے ہاتھ جوڑے نگاہ ماں کے چہرہ پر تھی کہ ایک ہچکی آئی اور ختم ہوا۔

بدنصیب ماں مردے کو کلیجہ سے لگائے تڑپ رہی تھی کہ کچھ خیال آیا اور وہی دوا خود پی لی، ایک چیخ ماری اور یہ کہہ کر لاش پر گری۔

"اے چاند اکیلا نہ سونے دوں گی"

لوگ دوڑ پڑے، فرید دل، آیا ڈاکٹر کو بلوایا، تنویر اسوقت ہوشیار ہوئی اور بآواز بلند کہا۔

"میں ہمایوں کی سچی چاہنے والی بدنصیب تنویر ہوں، میرے تینوں لال مجھ سے چھوٹ گئے اور اب تھوڑی دیر بعد میں بھی دنیا

سے رخصت ہوتی ہوں، قیامت کے دن خدا اس بات کی شہادت
دے گا کہ تنویر کا دامن عصمت کے ہر دھبہ سے پاک ہے، میری
قبر میرے لال کے برابر بنا دینا کہ جب تک گہری نیند سوؤں
میرا بچہ میرے کلیجہ سے چپٹا رہے" تنویر کی گفتگو یہیں تک
پہنچی تھی کہ اس کی آواز لڑکھڑا گئی، اس نے فرید دل قدر سے
بدقت کہا کہ

"میرے سرتاج میرے قصور معاف"

اور ختم ہوئی۔

عصمت جولائی ۱۳ء

مامون الرشید کا دربار

اور

ایک سچّی عورت

(۱)

زمانہ اگر فرصت اور زندگی کے جھگڑے اجازت دیں تو مسلمان عورتیں اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ صداقت نے کیا کیا جوہر دکھائے اور کلمہ توحید کی پڑھنے والیاں کس دل اور گردے کی عورتیں تھیں کہ دنیا کی ہر حالت اُن کی صداقت کے سامنے ہیچ تھی، دولت جس کے نشہ نے آج دماغ مست کر دیئے، حکومت جس کے زعم نے اس وقت انسانیت ختم کر دی، مرنے والی بیبیوں نے صداقت کے مقابلہ میں پاؤں سے ٹھکرا دی اور دنیا کو دکھا دیا کہ سانچ کو آنچ نہیں۔

زندگی میں آنکھوں پر رکھنے اور مرنے کے بعد حوروں کی صف میں جگہ پانے کے قابل تھیں وہ متبرک ہستیاں جنہوں نے دنیا کی ہر مصیبت کو راحت اور ہر اذیت کو عشرت سمجھا اور صداقت کو ہاتھ سے نہ دیا۔ وقت نے ان کا ساتھ دیا، قدرت نے اُن کی قدر کی اور انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ فلک پیر کے ایک ہی دور میں وہی کائنات جس کا ہر ذرہ جان کا دشمن تھا قدموں میں لوٹ رہی ہے، یہ واقعہ ہے کہ تلوار کی دھار پر، برچھی کی انی پر، پھانسی کے تختہ پر صداقت کا ہمیشہ بول بالا رہا اس میں وہ مخفی دولت اور پوشیدہ طاقت ہے جیسے مظلوم کو ظالم پر، محکوم کو حاکم پر اور کمزور کو

طاقتور پر ترجیح دی اس قوت کا اندازہ نہ ہو سکے مگر واقعات دکھا رہے ہیں کہ حکومت اس کے سامنے ہیچ سلطنت اس کے روبرو ٹیچر اور طاقت اس کے مقابلہ میں لغو۔

(۳)

دولت عباسیہ کا وہ تاجدار مامون الرشید جس نے نوشیرواں کے عدل اور حاتم کی سخاوت کو دنیا کے دل سے فراموش کر دیا سلطنت بغداد پر جلوہ افروز ہے۔ شہزادہ عباس مامون الرشید کا بڑا لڑکا طائفۃ النمل کے قریب شکار میں مصروف ہے۔ غروب ہونے والے آفتاب کی شعاعیں آب دجلہ کے قدموں میں لوٹ رہی ہیں۔ طائران خوش الحان کے نغمہ میں منہمک جو کنار دریا پر وداع روز روشن کا مرثیہ پڑھ رہے تھے ایک حسین عورت پانی کا گھڑا بھر رہی تھی عباس اس کو دیکھ کر آگے بڑھا اور پوچھا "تو کون ہے؟ اور کس خاندان سے متعلق کیا ایسے غیر آباد مقامات پر بھی جہاں پہاڑ اور جنگلوں کے سوا کچھ نہیں ہے حسن جنم لے سکتا ہے"! شہزادہ اپنا فقرہ ختم کر کے دیکھتا ہے تو غیور حسینہ کے چہرہ پر بل آ چکا تھا اُس کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا اُس نے شہزادہ کا سوال حقارت سے ٹھکرا دیا اور آگے بڑھی۔ باپ کی عظیم الشان حکومت کا جن عباس کے سر پر سوار تھا حکم دیا اس مغرور عورت کا حسب نسب معلوم کرو اور میری طرف سے نکاح کا پیغام دے دو۔ نوکر چاکر اس عورت کے پیچھے روانہ ہوئے۔ شہزادہ نے اپنا شکار ملتوی کیا اور خیمہ میں آکر خاموش بیٹھ گیا آدھی رات تک اسی اُلجھن میں گرفتار رہا کبھی خیمہ سے باہر آتا تھا کبھی اندر کہ ایک خادم نے

آکر عرض کیا عورت خاندان برامکہ کی لڑکی مغیرہ بنت ازوار ہے وہ دو بچوں کی ماں اور حسین ابن موسیٰ کی بیوہ ہے اس کے ورثا میں سے اب کوئی زندہ نہیں صرف دو معصوم بچے ہیں۔ نکاح کا پیغام اس کے واسطے قیامت سے کم نہ تھا آپے سے باہر ہو گئی اور یہ الفاظ کہے "ہارون ہماری جانیں تباہ کر چکا اب مامون ہماری عزت کے درپے ہے لیکن عباس یاد رکھے کہ اس کی شہزادگی اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی دہلیز پر دونوں ہاتھوں سے مسل دوں گی"

(۳)

رات کا پردہ دنیا کے چہرہ سے اُٹھا ادھر صبح صادق آل برامکہ کی بربادی کا نوحہ کرتی ہوئی نمودار ہوئی ادھر طائفۃ النمل کے ایک مختصر سے مکان میں مغیرہ نے نماز فجر سے فراغت پا چھوٹے بچہ کو کلیجہ سے لگا کر پیار کیا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عباس شہزادہ کا یہ پیغام ایک قاصد کے ذریعہ سے اس کے کان میں پہنچا "شہزادہ عباس کا غصہ تیری جان اور مال خاک میں ملا دے گا یہ مکان ضبط کیا جاتا ہے اور تجھکو دو گھنٹہ کی اجازت ہے یہ مکان خالی کر دے"

مغیرہ یہ پیغام سُن کر دروازہ پر آئی اور قاصد سے کہا "عباس اس وقت کو بھول جائے جب بڑے دادا جعفر کا سر اُس کے دادا ہارون کے سامنے رکھا گیا اور اس بے گناہ قتل نے آل برامکہ کو دو دو دانوں کو محتاج کر دیا لیکن برامکی بیبیاں مذلا لم عباسیہ کو جس تحمل سے برداشت کرتی آئی ہیں تاریخ اس کو فراموش نہیں کر سکتی"

اتنا کہہ کر مغیرہ ایک سفید ردا سر پر ڈال دونوں بچوں کو

ساتھ سے باہر نکل گئی۔

(۳)

دوسری صدی ہجری ختم کے قریب ہے مامون الرشید کا دربار گرم ہے منیرہ کے چہرہ پر جو چودھویں رات کے چاند کو شرماتا تھا ضعیفی کے آثار نمودار ہو گئے مامون کے پہلو میں عباس تخت نشین تھا امراء وزراء خاموش بیٹھے تھے کہ مظلوم منیرہ دربار شاہی میں حاضر ہوئی اور کہا کہ" ایک بیوہ کا مکان صرف اس لئے کہ وہ اپنی عصمت کی محافظ تھی سلطنت عباسیہ کو مبارک ہو لیکن مامون الرشید ایک دن اس بادشاہ کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی سلطنت کبھی فنا نہ ہوگی۔ شہنشاہ ظالم کی ستائی تیرے پاس فریاد لائی ہوں انصاف کر اور داد دے" دربار عورت کا منہ تکنے لگا مگر کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ بادشاہ کی موجودگی میں اس سے بات کر سکتا مامون الرشید نے عورت سے کہا" اس ظالم کا نام بتا کہ وہ کون ہے" عورت ہنسی اور ہنسکر کہا کہ" شہزادہ عباس جو تخت شاہی پر تیرے برابر بیٹھا ہے آج مسلمان دنیا بھر کے عیوب کا مخزن ہو چکا ہیں مگر یہ مردہ قوم کبھی زندہ بھی تھی، مامون کا چہرہ اتنا سنتے ہی غصہ سے سُرخ ہو گیا اُس نے چوبدار کو حکم دیا کہ" عباس کو اس عورت کے برابر کھڑا کر دے تاکہ مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی امتیاز نہ رہے" شہزادہ عباس خاموش تھا اور ہر سوال کے جواب میں رُک رُک کر ایک آدھ بات کہہ دیتا تھا۔ منیرہ دو دفعہ تلے سے اپنی داستان مصیبت بیان کر رہی تھی اس کے

چہرہ سے عصمت کا خون ٹپک رہا تھا۔ یہاں تک اس کی زبان سے یہ لفظ نکلے "عباس یہ صحیح کہ تو مامون الرشید کا لڑکا اور سلطنت کا مالک ہے لیکن یہ ہاتھ منتظر تھے اس وقت کے کہ اگر تو اپنی دھن میں آگے بڑھ کر قریب پہنچتا تو تیری گردن خاک میں ملا دیتے آل برامکہ کی دولت عباسیوں نے پامال کر دی مگر ہماری عصمت وہ دولت ہے کہ ہم عباسی سلطنت کو اس پر سے قربان کر دیں۔"

وزرار مغیرہ کی جرأت پر متعجب ہوئے اور کہا کہ "یہ بیباکی آداب شاہی کے خلاف ہے ادب سے گفتگو کر مامون نے کہا "اُس کو مت روکو یہ حق رکھتی ہے کہ جو کچھ اُس کے منہ میں آئے کہے، یہ صرف اس کی صداقت ہے جس نے اس کی زبان کو تیز اور اس کے حوصلہ کو بلند کر دیا اور عباس کی کمزوری ہے جس نے اس کو گونگا بنا دیا۔" اسی وقت پانچ تھیلیاں اشرفیوں سے بھری ہوئی اپنے ہاتھ سے لے کر مامون الرشید نے مغیرہ کے قدموں میں ڈالیں اور نہ صرف اس کا مکان واپس کیا بلکہ قصر عباس جو جلیل الشان تھا مغیرہ کو عطا فرما کر درخواست کی کہ وہ شہزادہ کا قصور معاف کر دے۔

"عصمت" اکتوبر ۱۹۱۹ء

اگلی محبتیں

ظہور مسیح سے کئی صدی پیشتر کا واقعہ ہے، صوبہ یمن اور یمن ہی
نہیں عرب کا تمام جنوبی حصہ عدن فارس نجران اس شخص کے
زیر نگیں تھے جس کا کوئی خاص عقیدہ تھا نہ مذہب، مگر امیر اور امیر
کے ساتھ تمام رعیت صرف ایک بت یغوث کی پرستش کرتی
تھی باوجود کثرت ریگستان و جنگل بیابان کے صنعا دارالخلافہ یمن رشک
جنت تھا یہ وہ رونق چہل پہل تھی جس کی شہرت سے سکندر اعظم
کے منہ میں پانی بھر آیا، فتح ہندوستان کے بعد اس کی دلی خواہش
تھی کہ صنعا کو دارالخلافہ بنائے مگر موت نے یہ حسرت پوری نہ ہونے
دی، صنعا جس کا آج تاریخ کے سوا کوئی نام تک نہیں جانتا اپنے
وقت میں وہ خطہ بے نظیر تھا۔ جس کی ایک دنیا گرویدہ تھی یونان
کی نگاہ اس پر تھی نصرانیوں کا دانت اس پر تھا، دارا اس کا مداح،
سپارٹی اس کے عاشق، گو رفتار زمانہ نے ابھی بساط تہذیب
پر پہلا قدم بھی مشکل سے رکھا تھا۔ لیکن خزائن فطرت تمام روئے
زمین کے صنعا میں مجتمع ہو گئے تھے عملیقیہ جشن کی دیوی جس کی دھاک
نے ایک عالم کو مسخر کیا، سر زمین صنعا سے اٹھی، حنظلہ جیسا جری
جس کی شہزوری و شجاعت سے سکندر و دارا لرز گئے صنعا میں
پیدا ہوا جو ہم جیسا انسان پر خلوص کی قربان گاہ پر صداقت
کا تاج مرصع سر پر رکھے حنظلہ پر نثار ہونے کو تیار ہوا۔ صنعا

سکے قبرستان میں سو رہا ہے حسن و شجاعت، خلوص و صداقت انسانیت کا کوئی جوہر ایسا نہ تھا جس کے ذرّے اس دورِ جہالت میں خاک صنعا میں نہ چمک رہے ہوں دو ہزار برس سے زیادہ گذر گئے، لاتعداد پھول چمنستان زندگی میں کھلے اور مرجھائے بے شمار روحیں دنیائے حیات میں آئیں اور گئیں، ان گنت حسین و شجاع دوست اور انسان بساطِ ہستی پر چمکے اور ماند ہوئے، مگر ملکہ بلقیس کا حسن، حنظلہ کی شجاعت اور جرہم کی صداقت آج تک بے نظیر ہے یمن کے در و دیوار، صنعا کے کوچہ و بازار آج بھی موجود ہیں اور وہی کہا جو اہیر یعرب کے دور میں تہذیب و ترقی کی بیسیوں منزلیں طے کر چکی، زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا چشم ظاہری ریت کے پہاڑوں اور ریگ کے تودوں کی بجائے اس وقت تک باغ و چمن دیکھ رہی ہے اونٹ کی کھال اور بھیڑ کی اون کے بدلے دیبا و حریر پیدا ہوگئے جہاں لوں کے تھپیڑے باد سموم کے جھکڑ تھے، خاک اڑتی تھی اور آگ برستی تھی وہاں اب لاکھ پھول لہلہا رہے، اور بلبل چہک رہے ہیں لیکن نظر عمیق اس تازگی میں گریہ اور مہکاریں نالہ دیکھتی ہے، ترقی دوسرے دلوں کو خوش کر رہی ہے، مگر خود عہد اولین کے ان مہ پاروں کو رو رہی ہے جو ما در صنعا کا نام تمام دنیا میں روشن کر گئے۔

(۱)

تمہاری منت پوری ہوگئی ایغوث کی عنایت تھی ورنہ جانا[۱] کبھی غلط

---

[۱] داہنی طرف سے بائیں جانب رستہ چلنے میں جانور کا نکلنا۔ ۱۲

نہیں ہوتا، تم آج ہی بھیڑ ذبح کردو اس کام میں دیر اچھی نہیں ایسا نہ ہو یغوث کا غصہ جوش میں آجائے تمہارے پھول سے رخسار اور نازک چہرہ اس غصہ کو کیونکر برداشت کرے گا۔

علیقیہ۔ بھیڑ ملنی مشکل ہے، شہزادہ ٹھیک ہو گا میں ابھی ڈھونڈنے جاتی ہوں کل بھی گئی تھی مگر بھیڑ ملی نہ ہرن، امیر کے ہاں کچھ بھیڑ یہاں موجود ہیں، ذرا آفتاب ٹھنڈا ہو جائے تو وہاں بھی جاؤں۔

حنظلہ۔ تم کو خود منت ماننے کی ضرورت تھی خوبصورت چہروں کا دیوتا کے سامنے پڑنا اچھا نہیں ہوتا مجھ سے کہا ہوتا، میں جاکر انتجا کر لیتا، اب جس طرح بھی ہو بھیڑ ہو، میں دنیا کی ہر طاقت کو ذلیل اور بدترین سمجھتا ہوں، مگر یغوث کی طاقت سے ہمیشہ ڈرتا ہوں، تم چپکے سے اپنی منت پوری کردو اور آئندہ اس کے سامنے نہ پڑنا، لیکن عنبرہ کا خیال ہرگز ہرگز نہ کرو، یہ چمکتی ہوئی پیشانی کٹورا سی آنکھیں، یہ سیاہ بال یغوث کے واسطے نہیں ہیں۔

علیقیہ۔ بھیڑوں کا گلہ صرف امیر کے ہاں موجود ہے مجھے کہتے شرم آتی ہے ایسا نہ ہو کہ وہ انکار کردے اور میری بات ضائع ہو۔

حنظلہ۔ اس زبان کو جو سوسن کو شرما دے بھیڑ کی درخواست امیر یعرب نا منظور نہیں کر سکتا، امیر کا تمام گلہ، امیری کی ساری امارت اور خود امیر اس صورت پر فدا ہو جائے گا،

علیقیہ۔ میں ابھی چلی جاتی ہوں، صرف اتنا ہی خیال ہے کہ امیر انکار نہ کردے۔

۱۔ بھیڑ کے آسانی سے میسر نہ آنے پر ہرن یا اور کوئی جانور ذبح کر دیتے کا نام عنبرہ تھا۔

حنظلہ۔ ابھی نہیں آفتاب گرم ہے، لو چل رہی ہے، دھوپ تیز ہے،
علیقہ اس صورت کی قدر میرے دل سے پوچھ

علیقہ۔ اگر ہرن چڑھا دیا جائے، تو کیا مضائقہ ہے میں تو جانوں
ہرن ہی ٹھیک ہوگا۔

حنظلہ۔ ہرن تو میں دم بھر میں لا دوں، مگر نہیں نہیں علیقہ
نہیں اپنی صورت پر میری حالت پر رحم کر اور عنیزہ کا خیال چھوڑ دے۔

علیقہ۔ اچھا اچھا چلی جاتی ہوں۔

حنظلہ۔ ابھی نہیں۔ کیوں اسقدر سنگ دلی پر کمر باندھی ہے
میری شجاعت کا سکہ دنیا بھر میں بیٹھ گیا، مگر تیرا دل فتح نہ کر سکا۔

علیقہ۔ تو کیا فتح کے یہ معنی ہیں کہ میرا دل بھی اپنے تیر میں لٹکائے
پھرے، ضرورت ہے تو لو دل نکال لو۔

حنظلہ۔ تمہارے پاس دو دل ہیں ایک اپنا ایک میرا۔ تمہارا
بغوث تم کو مبارک کرے میرا اس زلف سیاہ میں لٹک رہا ہے۔

صفا کی دونوں لاجواب ہستیاں، ایک حسن کی مجسم تصویر، دوسری
شجاعت کا بہترین نمونہ راز و نیاز میں مصروف تھیں یہ نسوانی تمکنت
اغماض جو ترقی تہذیب کے ساتھ عورت کی سرشت میں بیٹھ کر فطرت
بن گئی ہے، علیقہ میں نہ تھی، اور یہ چھوٹی خوشامد اور تصنع جو ایسی حالت
میں جب محبوب عورت کی صورت میں پیش نظر ہو، مردوں کی طبیعت
ثانیہ نظر آتی ہے، حنظلہ سے ہزاروں کوس دور تھے، فطری جذبات
دونوں میں موجود تھے، طریقہ اظہار موجودہ تمدن سے مختلف تھا؛

مگر محبت کا اثر دونوں دلوں پر ظاہر تھا، حنظلہ کی نگاہ محبت کے مکمل
اثرات لئے ہوئے اپنی محبوبہ کے چہرہ پر پڑتی تھی اور علیقیہ کی ہر ادا اثر
الفت کو قبول کرتی ہوئی حنظلہ کا جواب دے رہی تھی، شام قریب
آئی، چادر آفتاب مکان کی ممٹیوں، گھر کی دیواروں، اور درخت کی
شاخوں تک پہنچی اور رفتہ رفتہ یہ شامیانہ خورشید بھی سروں سے
اٹھ گیا، علیقیہ کھڑی ہوئی حنظلہ نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، اس
کا سر اپنے سینہ سے لگایا اور علیقیہ قصر امیر کی طرف روانہ ہوگئی،

(۳)

منزل آفتاب کے ابتدائی قدم تھے، مگر ہوا حلاوت و تمازت میں
شرابور تھی والی نجد کوہ ارسم پر مسلح کھڑا تھا تیغ برہنہ اس کے ہاتھ میں تیر و
کمان اس کے پہلو میں، چہرہ غصہ سے سرخ اور پیشانی پر بل، تمام فوج ہتھیار
لگائے اور لباس جنگ پہنے حکم شاہی کی منتظر تھی، دفعتہ والی نجد نے
فوج کی طرف دیکھا، اور کہا۔

"کیوں شجاعان نجد کیا کہتے ہو، تم لاکھ تعداد میں تھوڑے، طاقت
میں کمزور ہو مگر تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنہوں نے اپنا خون گرا کر نجد کو دشمنوں
سے بچایا یہ فصیلیں اور یہ مکان جو تم کو نظر آرہے ہیں مرنے والوں کی بہادری
کا ثبوت اور تمہارے بزرگوں کا نشان ہیں، ان کے خون ان بنیادوں کا گارا
بنے اور انہوں نے خود فدا ہو کر نجد تمہارے سپرد کیا، اب اس کی
حفاظت کے تم ذمہ دار ہو، فارس اور بحران سب دشمن کے قبضہ میں ہیں
اور تم بتیس دانتوں میں ایک زبان کی طرح اس مقام پر زندہ ہو، بچو تو
آج پوری دو صدیوں سے تمہاری تیغ کشی پر آمادہ ہیں۔ مگر ہم اپنے تبرک

دیوتا سرقان کی بدولت اب تک راج کر رہے ہیں اور ہمیشہ کریں گے، آثار
ہتو کو اشتعال نہیں معلوم ہوتے تاہم کل کا ہنگامہ ضرور کچھ نہ کچھ رنگ لائیگا
تم اس وقت کے واسطے تیار رہو، جس جس اپنی گردنیں اپنے وطن اور پاک
سرقان کے قدموں پر قربان کرو، یغوثی طاقم ہمارے دیوتا کی بے ادبی
کرنے میں، کوئی دقیقہ نہ چھوڑیں گے۔ اے پاک اور متبرک سرقان ہم کو
وہ وقت نہ دکھائیو، میں نے آج تم سب کو اسی واسطے اس مقام پر
جمع کیا ہے کہ تم اپنے اس خدا کی صورت کو دیکھ لو، جس پر حملہ کرنے کی
دشمن تیاریاں کر رہا ہے۔ اگر ہم میں ہمت موجود ہے، اپنا وطن ہم کو
عزیز ہے اور جانیں عزت سے زیادہ عزیز نہیں تو ضرور متبرک سرقان
کی مدد ہمارے ساتھ ہے، اور اگر یہ ساتھ ہے تو ایک یغوث کیا تمام
دنیا ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی، پچھلے معرکہ میں جس کو آج بیس برس ہو گئے
تمہارے بزرگوں نے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے، یمن اس وقت سے
زیادہ طاقتور نہیں، دل پر رکھو گے، تو تھوڑی دل فوج دم بھر میں زیر کر لو
گے، بڑھو اور ان پاک قدموں پر اپنا سر رکھ کر وعدہ کرو کہ جب تک
جان میں جان ہے منہ نہ پھیرو گے ان قدموں پر نثار ہو جاؤ گے، مگر منہ
نہ ہٹاؤ گے”

والی کی تقریر ختم ہوتے ہی خانقاہ سرقان سے وہ پجاری جو وہاں
کا مجاور تھا نکلا، سب نے اپنی گردنیں جھکا دیں، اس نے چند پھول
والی کے سر پر ڈالے اور سرقان کے قدموں کی مٹی اس کی آنکھوں سے
لگا کر ترقی کی دعا کی، اس کے بعد تمام فوج نے سرقان کے قدموں کو اور
پجاری کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، وفاداری کے عہد کئے اور بآواز بلند اس

شخص نے جو ذرا پیچھے ہٹا سکتا ہے کہا۔

"ہم شہرک سرداران کے قدموں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگا کر اقرار کرتے ہیں کہ دشمن کے مقابلہ میں ایک قدم پیچھے نہ ہٹائیں گے، جس طرح ہمارے بزرگوں نے اپنی پیاری جانیں ان قدموں پر قربان کیں ہم بھی نثار ہوں گے اور اپنی شجاعت سے یغوثی مکاروں کو مزا چکھا دیں گے۔"

(۱۳)

"امیر کے اس اضطراب سے تمام یمن دنگ ہے اور شہزادیٹ کا ہر بچہ اور بڑا حیران و پریشان ہو رہا ہے اگر کوئی مہم پیش آئے تو امیر کے عدل سے سرزمین صنعا کا ہر فرد بشر اس لئے کہ آج شیر بکری اس راج میں ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں، امیر پر اپنی جان قربان کرنے کو موجود ہے اگر کوئی اندیشہ لاحق ہے تو مجھ جیسے جان نثار کو مطلع فرما دیجئے، تاکہ اس کا انتظام کروں اور اگر ضرورت ہو تو صرف خود بلکہ اپنے تمام خاندان کو امیر کی عزت پر تصدق کردوں مگر یغوث شہرک کا واسطہ دل کا حال بیان کیجئے اور فرمائیے کہ چند روز سے کیا کیفیت ہے؟"

امیر۔ جو راز اس وقت تک دل میں چھپا رہا، جو بات آج تک زبان پر نہ آئی کس طرح تیرے سامنے بیان کروں، عمان میں نے اپنی حالت درست کرتے ہیں کسرت کی تجبیر معمولی طور پر سیر و شکار کو میں گیا، نیزہ بازی میں مصروف ہونے کی کوشش میں نے کی، قنیات سے دل بہلانا میں نے چاہا، سمندر کے کناروں پر میں گیا، صرف اس لئے کہ جو چیٹک میرے دل کو لگ رہی ہے وہ کسی طرح ختم ہو جائے مگر.....

عمان ۔ آخر مجھ پر بھروسہ نہ کرنے کی وجہ کیا ہے، میری خدمتیں اس قابل نہیں کہ ایسے موقع پر بھی میں کام نہ آسکوں ۔ عمان زندہ رہے اور امیر کی پریشانی رفع نہ کر سکے !

امیر ۔ میرے سامنے کوئی ہم ہے نہ پریشانی کوئی تشویش ہے نہ کھٹکا، کچھ کہہ سکتا ہوں نہ بتا سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عمان ۔ یہ خنجر آبدار موجود ہے، اگر عمان آج تک اس بھروسہ کے لائق ثابت نہ ہو سکا تو اب اسکی زندگی فضول ہے، یہ ملاحظہ کیجئے کہ عمان اپنے امیر پر قربان ہوتا ہے ۔

امیر نے عمان کا ہاتھ پکڑ کر خنجر چھین لیا اور خاموش ہو گیا چند لمحہ کیفیت سکوت طاری رہی، امیر ادھر ادھر ٹہلتا رہا اس کے بعد کہنے لگا ۔

امیر ۔ عمان کیا کہوں کچھ نہیں کہہ سکتا، تم جیسے مخلص دوست جس مقام پر موجود ہوں، وہاں ایسی مصیبت جس نے مجھ کو حواس باختہ کر دیا، یقیناً تعجب انگیز ہے مگر میں کس طرح کہوں اور کیا کہوں کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے، صنعا میں اس وقت سب کچھ ہے، دولت شجاعت اقبال، برکت یغوث کی عنایت سے سب چیزیں میسر ہیں لیکن وہ چیز ہیں جس پر صنعا ہمیشہ فخر کرے گا ایک صورت ہے ۔ عمان کیا کہوں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔

عمان ۔ امیر! میں قدیمی نمکخوار ہوں عمر اس خدمت میں بسر کی ہے، مجھ پر اس وقت تک زندگی حرام ہے جب تک امیر کو اطمینان میسر نہ ہو جائے، میرا خیال ہے کہ کوئی صورت پسند آگئی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اس کا حاصل ہونا کوئی بڑی بات نہیں،

امیر۔ ہاں ہاں عمان ٹھیک ہے، دوستی، پہنچ سکتا ہوں، وہ نفس ہے جس پر ہمیشہ ہمیشہ تنہا ناز کرسکتا، وہ عورت ہے جس پر میں دشت الفہر نچھاور کرونگا، مگر وہ حاصل ہونیوالی شے نہیں ہاتھ آنے والا خزانہ نہیں، قبضہ ہو جانے والی سلطنت نہیں وہ پھول ہے جو ہماری دسترس سے اور ہمارے اختیار سے باہر اور ہمارے قبضہ سے پرے، عمان کیا کہوں اور کیا بتاؤں، علیقیہ ......

عمان۔ امیر کا خیال سچا، امیر کا انتخاب درست، امیر کی رائے صائب، آج تمام یمن اس کا مداح، اور عرب اس کا معترف ہے مگر وہ حنظلہ کی شجاعت پر اپنا دل نثار کر چکی ہے، اور اس وقت کس کی ہستی ہے کہ علیقیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لے۔

امیر۔ یہی وہ خیال ہے جس نے میری جان پر بنا دی اور میں اس سے مایوس ہوں، شب و روز اسی فکر میں ہوں، مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

(۳)

گرمی کے تکلیف دہ موسم میں صبح کا ٹھنڈا وقت بسا غنیمت تھا، دریا کی لہریں اپنے وجود فنا سے چشم تماشائی کو حیات انسانی کا مرقع دکھا رہی تھیں، علیقیہ کے ہاتھ حنظلہ کی گردن میں حمائل تھے، آنکھ سے آنسو جاری تھے اور منت سے کہہ رہی تھی،

”نجد کی بیشمار جمعیت کے مقابلہ میں یہ مختصر دستہ سو سپاہیوں کا کھلی ہوئی شکست ہے امیر کی بے ایمانی اسی سے ظاہر ہے کہ اتنی زبردست ہجوم اور یہ مختصر لشکر!“

حنظلہ۔ تم امیر کے ملازم نہیں ہو اور دنیا کا وسیع میدان ہمارے سامنے کھلا ہوا ہے صنعا پر لعنت بھیجو اور کہیں اور چلے چلو، مگر جان بوجھ کر موت کے منہ میں نہ جاؤ، میں جانتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ والی نجد مدتوں سے تیاریاں کر رہا ہے وہ اس وقت کا منتظر ہے کہ حملہ کیا جائے اس نے ایسے ایسے جری اور بہادر جمع کئے ہیں جو آج اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اگر ایسی ہی جان دوبھر ہے تو پہلے مجھکو مار دو اور اس کے بعد جانے کا ارادہ کرو۔

حنظلہ۔ عملیقہ! دل تیرا، جان تیری، میں تیرا، میرا مال و متاع تیرا، مگر کمزور بات زبان سے نہ نکال، میری شجاعت کا ڈنکا چاردانگ عالم میں بج رہا ہے مجھ کو اس کمک کی کچھ چنداں ضرورت نہیں، صرف میرا نام فتح کے واسطے کافی ہوگا، کس کی ہستی ہے کہ میدان میں نکل کر میرا مقابلہ کر سکے، یعرب کی بدبختی ظاہر، تیرا خیال صحیح اور گمان سچا، مگر وہ بات نہ کروں گا۔ جس سے میری شجاعت پر حرف آئے، میں اکیلا تمام نجد کو کافی اور فوج کو بہت ہوں، پاؤں میں زنجیر محبت ضرور ہے مگر دل میں شجاعت کا دریا موجزن ہے۔ اس سر کو سب سے پہلے تیرے پاؤں پر رکھتا ہوں اور اس کے بعد جاتا ہوں۔ یعرب کا حوصلہ نکل جانے دے اس کو معلوم ہو جائے گا کہ حنظلہ کس جرأت کا انسان ہے اس کے بعد سودائے خام اس کے دل سے دور ہو جائیگا لیکن اب جبکہ میں زبان دے چکا ہوں تو کوئی طاقت مجھکو روک نہیں سکتی۔

عملیقہ۔ مگر اس میں کیا خرابی ہے کہ میں بھی ساتھ چلوں، اور میدان

جنگ میں حنظلہ کے ساتھ دشمن پر بجلی کی طرح جھپٹوں۔

حنظلہ بے شک کوئی نقصان نہیں، لیکن میری شجاعت یہ اجازت نہیں دیتی کہ میں تم کو بھی میدان جنگ میں لے جاؤں،

عملیقیہ حنظلہ یہ ظلم ہے، اور تو یغوث کے سامنے اس کا جواب وہ ہوگا ایک نازک دل ایک عورت کا دل تیرے اس ستم سے ٹوٹتا ہے اور تو مجھ پر وہ مصیبت ڈالتا ہے جو میری زندگی برباد کر دے گی،

حنظلہ یہ رحم کا وقت ہے، میں جاتا ہوں، مگر میرا دل تیرے پاس ہوگا تو نہ ہوگی، مگر تیرا خیال ہر لمحہ میرے ساتھ،

اتنا کہہ کر حنظلہ نے نہایت نرمی سے عملیقیہ کے ہاتھ اپنی گردن سے جدا کئے، ان ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا آگے بڑھا اور پھر پلٹ کر نہ دیکھا۔

(۵)

رات کی اس تاریکی، ہوا کے اس سناٹے، بجلی کی اس چمک اور بادل کی اس کڑک میں امیر کا بھیس بدلے رعیت کا حال معلوم کرنے کے واسطے گھر گھر پھرنا یقیناً صنعا کی خوش قسمتی ہے۔

امیر عملیقیہ! مجھے تیرے ساتھ سچی ہمدردی ہے اور دل چاہتا ہے کہ تجھ سے سلوک کروں مگر . . . .

عملیقیہ رعیت ہر حال میں اور ہر وقت اپنے بادشاہ کے سلوک کی منتظر اور رحم کی مستحق ہے مگر امیر کی عنایت اور یغوث کی برکت سے میں کسی سلوک کی خواہشمند نہیں ہوں، صرف اتنا چاہتی

ہوں کہ امیر کی نظر عنایت مجھ پر ہمیشہ رہے،

امیر۔ تو نہایت بدنصیب عورت ہے اور حنظلہ کے خیال کو اپنے دل سے دور نہیں کرتی، مگر یاد رکھ وہ زندہ واپس نہیں آسکتا، اس کی جمعیت ساتھ نہ دے گی، اور تعجب نہیں کہ وہ اب تک کام آچکا ہو۔

علیقیہ۔ امیر کا ارشاد سر آنکھوں پر، مگر حنظلہ کے ساتھ ایک شخص موجود ہے جو حنظلہ پر آنچ نہ آنے دیگا، اور سب سے پہلا شخص جو حنظلہ پر قربان ہوگا جرہم ہوگا یہ وہ شخص ہے جس کی موجودگی میں میں ہرگز ہرگز محبت کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

امیر۔ ہاں میں جرہم کا ذکر اس کی محبت کا حال سن چکا ہوں، اور مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی میدان جنگ میں حنظلہ کے ساتھ ہے، لیکن یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ دونوں کبھی کے مرچکے ہونگے ایسی حالت میں تو نو سو قبیلوں کی سردار ہی نہیں بلکہ ملکہ ہوگی جس کے واسطے اس وقت روئے زمین کی ہر عورت آرزومند ہوسکتی ہے۔

علیقیہ۔ مگر میں عنایت سلطانی سے کوئی آرزو نہیں رکھتی، اگر پاک یغوث مجھ کو یہ دن دکھائیگا کہ میں حنظلہ کی موت سنوں تو پھر مجھے زندہ رہنے کی ضرورت لیکن امیر! حنظلہ وہ شجاع ہے جس پر غالب آنا آسان نہیں ہے، نجد اس کے سامنے ہیچ، اور والی نجد کی تمام طاقت بیکار ہے، وہ تن تنہا نجد کو فتح کرنے والا شخص ہے وہ جمعیت کا محتاج نہیں امیر کے اقبال اور یغوث کے انعام سے وہ صنعا کا نام نجد میں روشن کرے گا اور ناکام نہیں آئے گا۔

امیر۔ تجھ کو معلوم نہیں کہ جب کسی شخص پر مصیبت آتی ہے

تو اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے وہی تیرا حال ہے، چونکہ تو ایک سخت مصیبت میں گرفتار ہونیوالی ہے اس لئے یہ تیری دیوانگی کا آغاز ہے ایک شخص یا دو نجد کی پوری جمعیت کے مقابلہ میں کیا خاک کر سکتے ہیں حنظلہ کی موت اور جرہم کی بربادی کے بعد تو علیحدگی ہو گی مگر یاد رکھ اس وقت مرحم امیر ہی تھا، جو مجھکو یہاں تک لے آیا، یہ وقت ہمیشہ نہ رہے گا، سوچ اور سمجھ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

علیقیہ۔ میں امیر کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کے بعد اپنی صورت کبھی امیر کو نہ دکھاؤں گی یہ وقت جس کو امیر نے فرمایا، اگر آگیا، اور حنظلہ مجھ سے جدا ہو گیا تو بھی یہ وقت نہ آئیگا کہ علیقیہ در دولت پر حاضر ہو۔

(۶)

حنظلہ کی جمعیت تعداد میں بہت کم تھی، مگر اس کی شجاعت کا سکہ نجدیوں کے دل پر اچھی طرح بیٹھا ہوا تھا، اور حنظلہ کا نام سنتے ہی نجدی پریشان ہو گئے، اور صلح کی تدبیریں سوچنے لگے، اگر میدان کارزار گرم ہوتا تو یقیناً یعرب کے حکم کے موافق حنظلہ کی جمعیت فرار ہو جاتی، اور حنظلہ زندہ گرفتار ہوتا یا مارا جاتا، مگر صنعا سے باہر نکلتے ہی آندھی کی طرح اٹھا اور بگولہ کی طرح چلا، آدھی رات کا وقت تھا کہ فصیل پر گولیوں کی باڑ پڑنے لگی، لشکر کی آمد کا غلغلہ شام ہی سے والی کے کانوں میں پہنچ چکا تھا اور تمام ارکین دربار بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، مختلف تجویزیں اور طرح طرح کی تدبیریں پیش ہو رہی تھیں، کہ گولیوں کی آواز آنی شروع ہوئی والی نجد کی فوج تعداد میں تو زیادہ

تھی ہی، شجاعت میں بھی ایسی گری ہوئی نہ تھی کہ حنظلہ گھول کر پی جاتا۔ مگر اس کا رعب ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے نام سے والیٔ نجد تھرا اٹھا۔ دیر تک گولیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر ایک کی ہمت نہ پڑی کہ جواب دیتا ابھی صبح میں دیر تھی کہ نجدیوں کو خیال آیا کہ اگر کہیں حنظلہ نے کوہ ارسم کا رُخ کر لیا تو مقدس سرقان کی بے ادبی ہوگی اور اس کا تمام بار ہماری گردنوں پر ہوگا اس خیال کے آتے ہی والی نے حکم دیا کہ روشنی میں صلح کا جھنڈا بلند کردو، حکم کی تعمیل ہوئی تھی کہ گولیاں موقوف ہوئیں اور صبح کے وقت نہایت احتشام اور اعلیٰ تزک کے ساتھ حنظلہ دربار نجدی میں داخل ہوا۔

امیر۔ نجد ہمیشہ یمن کا باجگزار رہا، اور اب بھی اسکو اپنا فخر سمجھتا ہوں، میں نے اپنے پہلے عریضہ میں بھی اس طرف اشارہ کردیا، گو پاک سرقان کی بدولت نجد مقابلہ کے واسطے ہر طرح تیار ہے، اور دلاوران جنگ کسی حال میں بھی میدان جنگ سے ہٹنے والے نہیں، لیکن بندگان خدا کی خونریزی کا بار نجد اپنے ذمہ میں لینا نہیں چاہتا، میں نہایت خوشی سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں، یہ ہدیہ قبول فرماکر امیر کو میرا سلام پہنچا دیجئے، اور یہ عرض کیجئے کہ نجد ہمیشہ یمن کا باجگزار رہے گا۔

حنظلہ۔ افسوس کہ میری دلی آرزو پوری نہ ہوسکی، میں چاہتا تھا کہ میدان جنگ میں نجدی زور آوروں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتا اور بتاتا، کہ یعفوتی فرمانبردار کیسی طاقت اور ہمت رکھتے ہیں، خیر! میں آپ کا تحفہ اور یہ پیام امیر تک پہنچا دوں گا

اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے الفاظ کی ہمیشہ عزت کریں گے۔

امیر۔ یہ دوسرا شخص آپ کے ساتھ کون ہے۔

حنظلہ۔ یہ میرا بہادر دوست جرہم ہے جس کے خلوص وصداقت نے یمن میں دھاک بٹھادی اور یہ وہ شخص ہے جس پر ہم اور آپ دونوں ہمیشہ فخر کریں گے۔

امیر۔ مجھے آپ کے دوست اور صنعا کے اس گراں بہا جوہر کو دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی مجھے اُمید ہے کہ آپ ان کو اجازت دینگے کہ والی نجد کا یہ تبوک (خلعت) قبول کریں

جرہم۔ محبت وعنایت کا دیا ہوا ایک پھول بلکہ پھول کی ایک پنکھڑی دولت کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں والی نجد کا بہت شکرگزار ہوں کہ میری اس قدر عزت افزائی کی لیکن میں ابھی والی نجد کا یہ احسان اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتا اگر تعلقات قائم رہے تو ضرور یہ انعام سر آنکھوں پر رکھوں گا، لیکن اس وقت اس قبولیت کے بعد میرا فرض ہوگا کہ میں نجد کی عزت کو اپنی عزت اور ذلت کو اپنی ذلت سمجھوں، نہ معلوم آئندہ واقعات کیا صورت اختیار کریں میں ایک غریب کسان کا لڑکا ہوں اور سردست اس کرم سے معافی کا خواستگار ہوں

(۷)

"حنظلہ کی خبر موت نے تمام آبادی میں سناٹا کر دیا، افسوس یہ ہے کہ جرہم بھی جانبر نہ ہو سکا فوجی دستہ کا بیان ہے کہ جرہم صرف زخمی ہوا، مگر زخم اس قدر کاری تھے کہ چند گھنٹوں

ہیں مر گیا، امیر کو اپنے جانباز شجاع کی موت کا سخت صدمہ ہے، مگر اب مناسب یہی ہے کہ تو امیر کے حضور میں حاضر ہو کر اپنی پچھلی لغزشوں کی معافی طلب کر، اور مجھے امید ہے کہ حنظلہ کی جاں نثاری دربار امیر میں تیرے عفو قصور کی سفارشی ہوگی۔

علیقیہ۔ دور ہو جا سامنے سے کمینے عمان، اگر حنظلہ مر گیا، تو اس کی موت ہزار زندگیوں سے بہتر، جو ہم اگر اپنے دوست پر نثار ہوا تو اس سے بھی یہ ہی توقع تھی وہ تیری نگاہ میں مر گیا مگر میری نگاہ میں زندہ ہے، اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، مگر افسوس تجھ پر اور تیرے امیر پر کہ اب بھی اپنی ذلیل حرکتوں اور رکیک کوششوں سے باز نہیں آتے او نا ہنجار کمینے، اور بزدل دغا باز او جھوٹے خوشامدی ایک غیور عورت ایک سچی انسان ایک وہ لڑکی جس کے پہلو میں دل ہے وہ روح جو ہمیشہ رہنے والی نہیں، جس کا حسن مٹنے والا ہے، جس کے سیاہ بال سفید اور لب سرخ مرجھانے والے ہیں وہ دل جو ایک شخص ایک ایسے شخص کی جس پر تو اور تیرا امیر نہیں تیری نسلیں اور امیر کی اولاد نا ز کر چکی، نذر کر چکی، اب دوسرے مرد کو نہیں دے سکتی، عمان پھوٹ جائیں یہ آنکھیں اگر حنظلہ کے سوا کسی دوسرے مرد پر محبت کے رنگ میں پڑیں، کٹ جائیں یہ ہاتھ اگر حنظلہ کے بعد بساط محبت پر آگے بڑھیں، غارت ہوں یہ پاؤں اگر حنظلہ کو چھوڑ کر کسی امیر والی یا شہنشاہ کی طرف ایک قدم بھی بڑھائیں میری عمر کا مشغلہ حنظلہ کی یاد بہت کافی ہوگی، اس کا خیال

میرے دل میں چھٹا ہوگا۔ اس کی تصویر میری آنکھوں کے اندر ہوگی جو ہم خوش نصیب تھا کہ حنظلہ پر قربان ہوا۔

عمان۔ یہ تازہ صدمہ ہے جو رفتہ رفتہ زائل ہو کر تیرے خیالات کو بدل دیگا، تو ڈھونڈے گی اور یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا تلاش کرے گی اور اس دن کو نہ پائے گی، حنظلہ کی موت انوکھی نہیں، ایسے ایسے ہزاروں مر گئے جو بسل نجدی اور لیلیٰ دونو نہ رہے، تو اس کی سیوک کب تک کر سکتی ہے، مٹی خوار اور زندگی ذلیل ہوگی، اگر اب بھی باز نہیں آتی تو تو جان اور اس وقت کو سمجھ جب تو خود ملتجی ہوگی اور صنعا کا ہر ذرہ تیری بے وقوفی پر لعنت بھیجے گا۔

علیقیہ۔ بس عمان زبان روک اور بات کو اتنا نہ بڑھا کہ میں تیری چرب زبانی کا پورا جواب دوں سامنے سے ہٹ اور اپنی صورت مجھے نہ دکھا۔

عمان۔ میں پھر تجھ کو آخری مرتبہ سمجھاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اپنی ان حرکتوں سے باز آ یہ وہ موقعہ ہے کہ چراغ لے کر ڈھونڈیگی تو میسر نہ آئیگا۔

علیقیہ۔ اچھا بس جاؤ۔

(۸)

"اے آسمان کے چمکدار تارو! تم وہی ہو جو کل تک میرے سر پر چمک رہے تھے، میں نے اس سے پہلے، تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا، آج میری راتیں تمہارے جلوہ دیدار میں ختم ہوتی ہیں، تم مجھ سے آنکھ نہیں ملاتے! دیکھو ابر کے سیاہ

ٹکڑوں کالے کالے بادلوں نے تمہاری چمک دمک ماند کردی، ابر کے ٹکڑوں میری حالت پر رحم کرو میں کچھ نہیں چاہتی، برسو نہ برسو، یہاں برسو وہاں برسو، پھٹ جاؤ!..... میں ان ٹکڑوں میں اس صورت کو دیکھ لوں جو میدان نجد میں ظالم امیر کے فریب سے قتل ہوئی۔"

رات آدھی کے قریب گذری تھی اور مخلوق پردۂ دنیا پر بے خبر نیند کے اثر میں تھی، متواتر شب بیداری اور اختر شماری نے عملیقیہ کی حالت خراب کردی تھی، چاہتی کہ کسی طرح کچھ دیر کے واسطے ان تعلقات سے بے خبر ہو جاؤں، اور پھر کہتی تھی کہ یہ کیفیت نہایت پُر لطف ہے نہ سوؤں، اور نہ رات اسی خیال میں بسر کروں، اسی الٹ پھیر میں تھی کہ دروازہ پر پاؤں کی آہٹ سنائی دی سمجھی کہ شاید امیر نے پھر کوئی نیا گل کھلایا، خنجر ہاتھ میں لیا اور اٹھی اور مصمم ارادہ کیا کہ امیر ہو یا عمال اس وقت یہ خنجر کسی نہ کسی کے خون سے لال ہوگا، لپکی دوڑی اور حالت طیش میں جھپٹی دو آدمیوں کی صورت اندھیرے میں دکھائی دی پوچھا، "کون ہو، کیا ہے، کیوں نہیں آئے ہو؟"

جب کوئی جواب نہ ملا، اور اندیشہ نے یقین کی صورت اختیار کی تو خنجر لے کر آگے بڑھی اور کہا "بزدل کمینوں اس وقت تم اپنی نالائقی کا مزہ چکھو یہ خنجر تم کو عملیقیہ کے حصول میں مدد دیتا ہے"

ایک زبردست ہاتھ خنجر کو پکڑ کے خاموش تھا، تڑپا رہی تھی، تڑپ

رہی تھی، خنجر چھن گیا، جوش میں بجھری اندر آئی۔ موم کی بتی نے
تمام روشن کو منور کیا، اور دونوں شخص سامنے آگئے۔

علیقیہ۔ کیا ہے ؟

علیقیہ۔ دور ہو، کون ہے ؟

میں !۔ حنظلہ !

علیقیہ۔ ہٹ ہٹ حنظلہ نہیں۔ ہامہ[۱] !

حنظلہ۔ نہیں نہیں میں ہوں، علیقیہ کیا کیفیت ہے۔

ایک عالم سکوت تھا پیچھے ہٹ کر ایک نگاہ علیقیہ کی دونوں چہروں پر پڑی اور بے ساختہ یہ کہہ کر دوڑی "حنظلہ زندہ ہے"۔ اس کے بعد جرہم کے پاؤں چومے، اور مفصل کیفیت بیان کی۔

رات کے صرف چند گھنٹے باقی تھے جو چند لمحوں کی طرح کٹ گئے، حنظلہ ہرگز ہرگز نہ چاہتا تھا کہ امیر کا ذکر ہو، مگر جرہم اور علیقیہ امیر کے فتنہ سے بے خبر ہونا پسند نہ کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ صنعا کو خیرباد کہیں اور نجد میں چلے جائیں، حنظلہ نفرت سے اس تجویز کو ٹھکرا رہا تھا، کہ مشورہ کی توپ چلی جس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کسی معاملہ خاص میں اپنے منتخب احباب سے مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ اس توپ نے علیقیہ اور جرہم دونوں کو پریشان کر دیا، اور ان کو یقین کامل ہو گیا کہ حنظلہ کے برخلاف اس وقت کوئی فتویٰ صادر ہونے والا ہے حنظلہ صرف اپنے دوست جرہم کی خوشامد میں مصروف

---

[۱] عقیدہ یہ تھا کہ اگر کسی مقتول کے خون عوض نہ لیا جائے تو ایک کیڑا مقتول کے جسم سے نکل کر قصاص کو پہنچتا ہے اس کو ہامہ کہتے ہیں

تھا اور بہ منت کہہ رہا تھا، کہ عسطلان یہاں سے سترہ کوس ہے، تیری بیوی اور معصوم بچے تیرے فراق میں مردے سے بدتر ہو گئے ہوں گے فوراً اپنے گھر روانہ ہو، مگر جرہم کسی طرح گوارا نہ کرتا تھا، کہ دوست کو اس حالت میں چھوڑ کر گھر چلا جائے علیقیہ خوب سمجھتی تھی کہ حنظلہ محض میری وجہ سے عنقریب امیر کے ہاتھوں کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے، مگر جرہم کی صداقت اس کے جذبات پر غالب آئی اور وہ بھی حنظلہ کی اس درخواست میں شریک ہوئی کہ جرہم اپنے بیوی بچہ سے جا کر ملے، اور اپنا دل منور اور آنکھیں روشن کرے دونوں التجاؤں نے بالآخر اثر کیا اور جرہم عسطلان کی سمت روانہ ہو گیا،

(۹)

عملیقیہ کی جھونپڑی سے نکل کر جرہم گھر کے قصد سے چلا، مگر امیر کے محل کا نظر آنا تھا کہ دوستی بیوی کی محبت بچہ کی مامتا پر غالب آئی اور دل نے صدا دی حنظلہ کو اس حالت میں چھوڑنا کہ امیر جان کا دشمن ہے دوستی کی شان سے بعید ہے، بیوی اور بچہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے مگر حنظلہ کی مصیبت پر کوئی آنسو گرانے والا بھی نہ ہوگا، شرم کا وقت ہے کہ اپنی نفسانیت کو دوستی پر ترجیح دوں اور اس پریشانی میں چھوڑ کر گھر چلا جاؤں، بہتر ہوگا کہ اس مشورہ کا پتہ لگاؤں، اور دیکھوں امیر کی صلاح کیا ہے، اور تجویز کیا ہو رہی ہے یہ خیال آتے ہی وہ امیر کے کمرہ خاص کی طرف چلا، دروازے بند تھے صرف ایک دروازہ خاص کھلا ہوا تھا، چاروں طرف اس توقع پہ پھرا کہ شاید کوئی آواز کان میں آجائے اور اگر پتہ چل جائے کہ حنظلہ کے برخلاف کیا

کوشش ہو رہی ہے تو اس کا انتظام کروں، اس وقت واقعات نے یہ یقین تو دلا یا کہ حنظلہ تھوڑی ہی دیر میں امیر کی سازش کا شکار ہوگا مگر سازش کا حال معلوم ہونے کے واسطے دل کی بیتابی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی یہاں تک صداقت کا یہ پتلا اور خلوص کی مجسم تصویر اپنے دوست کی مصیبت کا پتہ لگانے کمرۂ خاص میں داخل ہوگیا، لوگ چیخ اُٹھے، دوڑ پڑے امیر غصہ کے مارے سُرخ ہوگیا، اور حکم دیا ابھی جرہم کی گردن اُڑا دی جائے، توپ کی دوسری آواز نے قتل کا اعلان کیا، حنظلہ اور عملیقیہ دونوں آزادانہ گفتگو کر رہے تھے حنظلہ نے پرواہ بھی نہ کی مگر عملیقیہ عورت تھی دل دھڑکنے لگا کہنے لگی یہ دونوں آوازیں تو قتل کی ہیں۔

حنظلہ۔ ہاں، مگر تم کو کیا ہزاروں واقعات ہوتے رہتے ہیں عملیقیہ نازک دل دہل جائیگا تم کو مقتل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

عملیقیہ۔ ممکن ہے کوئی بے گناہ قتل ہوتا ہو، امیر نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے دیکھنا تو چاہیئے،

دونوں کے دونوں مقتل میں پہنچے، پہلے عملیقیہ کی نظر جرہم پر پڑی، اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی، اور پاؤں میں بیڑی، جلاد تیغ برہنہ لئے سر پر کھڑا تھا، اور حکم کا منتظر،

عملیقیہ۔ یہ تو جرہم ہے میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں!

حنظلہ۔ بے شک یہ کیا غضب ہوا!!

حنظلہ آگے بڑھا، دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر پڑیں اور حنظلہ نے کہا "جرہم کیا واقعہ ہے"۔

جرہم مسکرایا، اور کہا کچھ نہیں کیا ہے، صداقت کی موت ایک

دوست کی جان بچانے کے واسطے، معمولی موت سے بہت بہتر ہو"۔
حنظلہ نے پورا واقعہ دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ جرہم دوستی پر قربان ہو رہا ہے اس کے دل نے گوارا نہ کیا مجھ کو اس حالت میں چھوڑ کر بیوی بچہ کے پاس چلا جائے، بیتاب اور بے چین ہو کر امیر کے سامنے گیا اور کہا،

"جرہم کا رزار ہستی کا قابل قدر رکن ہے اس کی زندگی دوستی کا ثبوت بیّن تھی، اور اس کی موت صداقت کا، یہ بے قصور ہے ارادتاً مقام مشورہ میں داخل نہیں ہوا، محبت تھی جو اس کو موت کے منہ میں لے گئی یہ محبت قابل سزا نہیں لائق قدر ہے اس کو معاف کر اور تو بھی جس طرح اس نے قربانی کی ہے اپنے عفو کا اس سے زیادہ چمکدار جوہر دکھا دے۔

امیر۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں، مشورہ شاہی میں بلا اذن رعیت کا داخلہ سزائے موت ہے، اور اس کا عفو نظام مملکت کو برباد کرتا ہے۔
حنظلہ۔ اگر میری درخواست قابل منظوری نہیں، اور جرہم کا قصور لائق عفو نہیں، تو میں صرف اتنی التجا پیش کرتا ہوں کہ اس کو کچھ مہلت دی جائے یہ حملہ میں میرے ساتھ شریک تھا۔ اس کی وفا شعار بیوی اس کا معصوم بچہ مدتوں سے چھوٹے ہوئے ہیں، اگر اس وقت وہ دونوں صورتیں جو اس کی زندگی کا تمام اساسہ ہیں دیکھ لے تو اطمینان سے تمام دنیا سے رخصت ہو کر یغوث کے قدموں میں حاضر ہو جائیگا۔
امیر۔ ایک شرط پر یہ درخواست منظور کی جا سکتی ہے جرہم کو اس شرط پر رہا کیا جاتا ہے کہ اگر غروب آفتاب تک یہ حاضر نہ ہوا تو

تیری گردن اُڑا دی جائے گی اور تیری اس منظوری کی ضامن علیقیہ ہوگی۔

(۱۰)

موضع عسقلان میں ایک عورت معصوم بچہ کو گود میں لئے بیٹھی ہے بچّہ رو رہا ہے اور کسی طرح خاموش نہیں ہوتا یہ آٹھ برس کی جان آج خلاف معمول باپ کی یاد میں رات بھر نہ سویا۔ آنکھ لگی، خواب میں دیکھا ہشیار ہوا، آوازیں دیں، گود سے اُترتا ہے، دروازے تک جاتا ہے اور پکارتا ہے چاروں طرف دیکھتا ہے، روتا ہے اور پھر آجاتا ہے، ماں پیچھے پیچھے جاتی ہے بہلاتی ہے، چمکارتی ہے اور لے آتی ہے گھر کا ایک نوکر ماں کے ساتھ بچہ کو بہلانے میں شریک ہے مگر دونوں حیران ہیں۔

ماں ۔ برہم صبر کر، لڑائی فتح ہوگئی ہوگی، تیرا باپ اب آتا ہوگا، پھول اس کی گود میں، دودھ اس کے ہاتھ میں دروازہ میں سے آواز دے گا، لو آؤ برہم دودھ لو، پھول لو، آؤ، دعا کریں کہ جلدی آئے۔

بچّہ ۔ نہیں نہیں اب آئیں، اب آجائیں،

ماں ۔ ہاں اب آئیں گے، دیکھو ہاتھ اُٹھا کر دعا کریں۔

خلاف معمول گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کانوں میں آئی، اور ماں نے کہا "لے دیکھ وہ گھوڑا آیا" آگئے، ابھی یہ فقرہ ختم نہ ہوا تھا، کہ جرہم گھر میں داخل ہوا، بچہ دوڑ کر باپ کے گلے سے لپٹ گیا بیوی کا چہرہ کھل گیا، دل خوشی کے مارے اچھل پڑا، کھڑی ہوگئی، جلدی جلدی پانی لائی، ہاتھ منہ دھلایا۔ تازہ دودھ لائی اور کہا۔

"ہمارے متبرک دیوتا یغوث کی برکت کہ ہم کو پھر یہ دن دکھایا،
اے پاک یغوث اب ہم کو یہ مصیبت کا وقت نہ دکھانا"
جرہم کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے، اس نے محبت کی دیوی کو
گلے سے لگالیا، اور تمام حال سنایا، بچہ کو پیار کیا، اور کہا جاؤ ایک
پھول توڑ کر لاؤ اور اپنی محبت کی نشانی مجھ کو دے کر اپنی معصوم آنکھوں
سے باپ کو رخصت کر دو"
بیوی سُن کر بے ہوش ہو گئی، بچے نے لاکر پھول دیا، آفتاب وقت
مقررہ کا نصف حصہ طے کر چکا تھا، بچہ کو گود میں لیا، اور بے ہوش بیوی کی
کے منہ کو بوسہ دیکر گھبرایا ہوا باہر آیا، تو نوکر نے اس خیال سے کہ کسی
طرح میرا آقا بچ جائے گھوڑے کو مار ڈالا تھا، پریشان ہو گیا بچہ کا ہوش
تھا نہ بیوی کا، چاروں طرف نظر دوڑائی کچھ نہ دکھائی دیا، اسی حالت
بیقراری میں پیدل صنعا کا راستہ لیا، مسافت زیادہ تھی اور وقت
تھوڑا۔ جرہم کی حالت اب الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی اس کو کسی چیز
کا علم اور کسی معاملہ کی خبر نہ تھی، جانتا تھا کہ کل صبح تک صنعا نہیں پہنچ
سکتا، بھاگا چلا جا رہا تھا، کہ ایک سوار آتا دکھائی دیا، روکا اس کے
قدموں میں گرا، اور کہا" ایک دوست کی جان جاتی ہے، دنیا
عمر بھر لعنت بھیجے گی، یہ وہ وقت ہے کہ ہر انسان مجھ کو مدد دے،
اور ایک بے گناہ کی جان بچالے، سوار نے گھوڑا دیا، سوار ہوا اور
سرپٹ چلا، صنعا ابھی ڈھائی کوس کے فاصلہ پر تھا کہ گھوڑا رہ گیا،
اور تھک کر گر پڑا۔

(۱۱)

آفتاب ڈھل چکا ہے، وہ وقت قریب ہے جب حنظلہ یا جرہم دونوں میں سے ایک دنیا سے رخصت ہوں گے، حنظلہ قید میں ہے اور علیقبہ اپنے گھر میں خاموش بیٹھی ہے اس کا سر نازک ہاتھوں میں ہے آنکھیں طوفان بپا کر رہی ہیں، اور دل کی بے چینی کسی طرح چین نہیں دیتی، وہ اسی حالت کرب میں دیوانہ وار باہر نکل جاتی ہے، ادہر ادہر دیکھتی ہے اور پھر آکر رونے لگتی ہے سوچتی ہے کہ جرہم بے گناہ پر آنہ سکا تو قابل الزام نہیں حنظلہ مارا جائیگا اور آج اس کی موت میری زندگی کا خاتمہ کردے گی، یہ خیال آتے ہی تڑپ اٹھی، کھڑی ہوئی باہر آئی، ایک فقیر دکھائی دیا، جس کا لباس یغوث کے راہبوں کا تھا، وہ فقیر قریب آیا، پوچھا کیا ہے کیوں پریشان ہے علیقبہ نے تمام داستان مصیبت سنائی تو راہب نے کہا،

"ایک امیر کی رضامندی تیری تمام تکالیف کو دور کرتی ہے کیا مضائقہ ہے کچھ ہرج نہیں"۔

علیقبہ- اس خیال سے نہیں کہ مجھے متبرک یغوث کو منہ دکھانا ہے، بلکہ اس لئے کہ میرا ایمان اجازت نہیں دیتا، میں مجبور ہوں، میرا دل اس خیال سے میری روح اس قصد سے لرز اٹھتی ہے آپ اپنی برکت سے مجھ پر اس قدر کرم کیجئے کہ ایک مرتبہ حنظلہ کی صورت دیکھ لوں۔

راہب- آ میرے ساتھ چل۔

راہب علیقبہ کو لئے جیل خانے کے دروازہ پر آیا حنظلہ پابجولاں باہر نکلا۔ حسرت بھری نظروں سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا

حنظلہ نے اپنی محبوبہ کو تسکین دی دونوں نے فقیر کا شکریہ ادا کیا اور مقتل کو روانہ ہوئے۔

آفتاب غروب ہونے میں گنتی کے چند لمحے باقی تھے مقتل میں دورویہ مسلح فوج کھڑی ہے اور سب کی نگاہیں میدان کی طرف لگی ہوئی ہیں عملیقیہ اور حنظلہ دونوں حاضر ہیں، کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں، اور کبھی جنگل کو، یہانتک کہ آفتاب نے بیمار کی طرح اپنا دم توڑا، اور روپوش ہوگیا غروب ہوتے ہی نعمان نے جلاد سے کہا، جلاد اپنا کام پورا کر، جہاں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی وہاں سناٹا تھا، حنظلہ نے اپنی گردن جھکائی، اور جلاد نے تیغ میان سے نکالی، عملیقیہ راہب کے آگے گڑگڑائی، اور کہا اپنی کرامت سے مجھ پر رحم کیجئے" راہب نے تامل کے بعد کہا "صرف امیر اس وقت تیری التجا قبول کر سکتا ہے میں تیرے ساتھ سفارش کے واسطے موجود ہوں بتا کیا کہتی ہے"

عملیقیہ۔ نہیں ہرگز نہیں، ایمان اور دل دونوں اس فیصلہ کے خلاف ہیں" جلاد وار کرنا چاہتا تھا کہ سامنے سے حرہم چیختا چلاتا بھاگتا دوڑتا آیا۔ مقتل میں داخل ہوتے ہی حنظلہ کو زندہ دیکھ کر اس کی تمام کوفت دور ہوگئی، اس کا دل باغ باغ ہوا اور فرط محبت میں حنظلہ مقید کے گلے سے لپٹ گیا اس وقت راہب نے پھر عملیقیہ سے کہا "بے گناہ شخص محض تیرے محبوب کی دوستی پر قربان ہوتا ہے، اس کی اس قربانی کا بدلہ یہی ہے کہ تو اس قدر محسن کش ہو اور اس کی جان کی پرواہ نہ کرے؟ میں اب بھی موجود ہوں کہ امیر سے تیرا قصور معاف کرا دوں"

علیقیہ: مقدس راہب مجھے اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، جرہم قتل ہوتا ہے میں حنظلہ کو بھی اس کے بعد صورت نہ دکھاؤں گی جرہم جیسے دوست کے بعد ہماری زندگی بے کار ہے، لیکن عصمت پر حرف نہ آنے دوں گی۔

مقتل میں چاروں طرف سے صداقت کے نعرے بلند تھے جب جرہم نے گردن جھکائی تو راہب آگے بڑھا، بھیس علٰحدہ کیا، تو معلوم ہوا امیر یعرب تھا، اس نے جرہم اور حنظلہ دونوں کو گلے سے لگا لیا، علیقیہ کے سر پر ہاتھ رکھا، اور کہا

"کچھ شک نہیں میری امارت کے مقابلہ میں تیری عصمت زیادہ قیمتی ہے، تو نے دکھا دیا کہ عورت کا جذبہ تاج شاہی سے فائق ہے، میں غلطی پر تھا، اور اب کہتا ہوں کہ تمہاری غیر محدود خوشیاں میری مختصر امارت سے زیادہ وسیع ہیں، خاک صنعا جس میں تجھ جیسی دیوی پیدا ہوئی آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے حنظلہ اور جرہم شجاعت وصداقت کے نمونہ حقیقی ہیں، وقت گذر گیا، مگر تمہارے چہرے مسرت حقیقی سے لبریز ہیں اور میری گردن عرق ندامت میں شرابور، میرا تاج شاہی تیری عصمت اور ان دونوں کی شجاعت وصداقت پر قربان ہونے کے قابل ہے میری غلطی کو معاف کرو، اور جاؤ خوش وخرم رہو"

جہانگیری عدل

فلک پیر زمانہ کے سینکڑوں اوراق اُلٹتا رہے لیکن تحقیق کی آنکھیں جو سماں دیکھ چکی ہیں وہ فراموش نہیں ہو سکتا، واقعات کی وہ لہریں جنہوں نے دریائے حیات میں آسمان سے باتیں کیں تھیں ہیں، مگر ہیں، ظاہری آنکھوں کے بند کرتے ہی تخیل کی رہبری سے مسافر وہیں جا پہنچتا ہے جہاں واقعیت کا سمندر مدتوں موجزن رہا۔ تاریخ کا یہ بحر وسیع آج خشک ہو کر ایک چٹیل میدان نظر آرہا ہے، جہاں مغربی معماروں کی صناعی جھلک رہی ہے، عالی شان محلسرائیں داغدار اور وسیع محلات اُجڑے پڑے ہیں تجسس کے قدموں سے اجنبی نو وارد آگے بڑھتا ہے مطالعہ کی عینک لگا کر اندر داخل ہوتا ہے اور شوق کے ہاتھوں سے عظیم الشان محلسراؤں کو بے نقاب کرتا ہے، مگر کوئی چیز بے داغ دکھائی نہیں دیتی، خاندان مغلیہ کے مسکن سودائے فخر کو دہا دیتے ہیں، اور حکومت کی دستکاری جس نے شیرازہ اقوام ایک کیا تھا، عجیب بھیانک صورت میں نظر آتی ہے کہ حکمرانی کے اجزا منتشر صفحات خصائل پریشان اور جوہر انسانیت میلا کچیلا، تیمور وحشیوں کے لباس میں، بابر فاقہ مستوں کی صورت میں، اکبر لامذہبی کے رنگ میں اور جہانگیر شراب کے نشہ میں سرشار دکھائی دیتے ہیں، شمع اشتیاق یہ رنگ دیکھ کر گل ہو جاتی ہے اور قلب مضطرب قدرت کی اس نیرنگی پر تعجب کرتا ہوا ہمیشہ کی نیند سو جاتا ہے۔

برسات کی رات تھی، لاہور کے شاہدرہ میں آدھی رات کے وقت اس شہنشاہ

کی خاک کا ڈھیر آنکھ کے سامنے تھا جس کے مجروح دل نے بیگم کا جمال مئے ناب میں دیکھا اور سلطنت ایک ساغر شراب پر حسینہ کی نذر کردی ، آنکھیں شوق سے کھلیں اور نفرت سے بند ہوئیں ارمان نے صدا دی کہ کاش خاک میں آرام کرنے والا جہانگیر ایسا نام چھوڑتا جس کو بقائے دوام میسر ہوتا لیکن حافظہ نے حیرت و حسرت سے اس صدا کو پاش پاش کر دیا اور بتایا کہ جس کی رات دور شراب میں صبح ہو جو قدرت کی تمام کائنات اور حیات کے تمام اجزاء صرف ایک صورت میں محدود سمجھے وہ اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا تھا، وداع شب کے قریب جب فراق مے لشکر ہوش و حواس لوٹ چکتا تھا تو خدام جام و سبو خود تیار کرتے تھے اور لرزتے لرزاتے شاہی ہاتھ اس کو ختم کر کے جہانگیر کو فرش پر بے ہوش ڈال دیتے تھے۔

جب حیات سلطانی کا انحصار حسن و مے دو اشیا پر ہو تو عدل و انصاف کی توقع غلط۔

تخیل استعجاب و حسرت کے پروں سے ہر سمت پرواز کر رہا تھا، رات سنسان تھی اور ایک ملک پر حکومت کرنے والے جلیل القدر شہنشاہ جہانگیر ابن اکبر کا جسد خاکی میرے برابر اندھیرے گھپ میں پڑا تھا، آنکھ لگ گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اکبر آباد کے ابتدائی دور نے مسند دوران پر ایک قدم اٹھایا ہے، نورالدین جہانگیر تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہے سعد اللہ خاں کوتوال شہر کا ڈنکا چار طرف بج رہا ہے شہسوار مشرق کی رفتار تیز ہونے لگی، بزاز کی ایک دوکان پر سعد اللہ خاں تشریف فرما ہیں برقنداروں کا جمگھٹ لگا ہوا ہے وسط سڑک پہ بہلوں کی ایک گاڑی گذری، ہوا نے گاڑی کا چھٹا ہوا پردہ اڑا کر سعد اللہ خاں کو ایک چاند سی صورت دکھا دی بادشاہ کی عاشق مزاجی کے

کے اثر سے با اختیار اہلکار کیوں محروم رہتے، کوتوال دیکھتے ہی لوٹ پوٹ ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ ضبط کرے اور جانتا تھا کہ کام اچھا نہیں مگر وارفتگی کا جن سوار ہو چکا تھا توسن طبیعت کو عشق نے مہمیز دی نشہ حکومت سمند ناز تازیانہ تھا حکم دیا "دیکھو کون ہے گاڑی کہاں جائیگی"

(۲)

وہی سرزمین اکبر آباد اور ایک کچی دیواروں کا ٹوٹا سا گھر، وہ ماں بیٹیاں اپنے اپنے کام دھندوں میں لگی ہوئی ہیں، لڑکی کے کپڑے میلے چکٹ ہیں کرتہ میں پیوند، دوپٹہ میں کھونپ ہاتھ میں سوئی گھٹنوں پر کپڑا ایسے خبر بیٹھی سی رہی ہے، خیال نہ معلوم کہاں ہے مگر استغراق کی یہ کیفیت ہے کہ کسی چیز کا ہوش نہیں، سایہ آفتاب زلف سیاہ سے، ہوا سرخ و سفید رخسار سے اور تمازت حسن لاجواب سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے،

چشم بینا غور و تامل کی اعانت سے اس ظاہری کثافت کی تہ میں نفاست کے خزانے پوشیدہ دیکھ رہی ہے، اس کے ہاتھ پاؤں ناک کان عارضی زیور سے لدے ہوئے نہ ہوں، مگر اس کا ایمان لازوال دولت سے مالا مال ہے، عفت و عصمت کا بیش بہا زیور اس کے چہرہ کو جگمگا رہا ہے اور گو عسرت و افلاس کی حد انتہا ہے لیکن جوہر شرافت پر بیش بہا جواہرات قربان ہو رہے ہیں،

دفعتہً ایک برقعہ پوش عورت گھر میں داخل ہوئی، لڑکی نے اُٹھکر سلام کیا۔ ماں نے پوچھا "بی بی کدھر آئیں، کہاں سے آئی ہو"

عورت۔ آئی کیا ہوں خدا کی شان دیکھنے آئی ہوں تمہاری بچی کا مقدر جاگ گیا، کوتوال شہر کا پیغام لیکر آئی ہوں، بادشاہ اپنی رنگ رلیوں

میں ہے، بادشاہی تو سعد اللہ خاں کی ہے۔ بیٹی دو اور شہر بھر پر حکومت کرو،
بیوی تقدیر کی بات ہے آج اچھے اچھے رئیس اور امیر جھوٹوں اشارہ پائیں
تو سچوں اپنی بیٹیاں اور بہنیں نکاح میں حاضر کر دیں، مگر دل کی بات ہے،
اُن کی ضد اور ضد کیا راج ہٹ ہے کہ ہو تو یہیں ہو۔ بیوی مبارک ہو،
نصیبہ جاگ گیا عمر بھر عیش کرنا۔"

لڑکی کے تیور بدل گئے، ناتجربہ کاری نے آتش غیرت بھڑکا دی اس
سنگین عمارت کی بنیاد جو قصر عصمت سے تعبیر تھا، ایسے صناع کے ہاتھوں نہ
چنی گئی تھی کہ زر و دولت کی جھڑیاں متزلزل کر دیتیں، یہ بنیاد و افغانی
خون اور سادات کے گارے سے پیوستہ تھی تھرّا اُٹھی، چاہتی تھی کہ کچھ
بولے، مگر ماں نے ٹھنڈا کیا اور مشاطہ سے کہا،

"بیوی کوتوال صاحب کی عنایت ہے کہ وہ ہم غریبوں پر اتنے مہربان
ہیں ہم رعیت ہیں وہ ہمارے حاکم۔ میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا
اور عرض کرنا سرکار اس بچی کا نکاح ہو چکا۔ ہم تو آپ ہی کا نمک کھا رہے
ہیں۔ اس کا شوہر سید نصیر آپ ہی کے برقندازوں میں ہے۔

(۳)

"حضور میں تو آسمان پر تھگلی لگانے والی بشر ہوں اس لڑکی کی تو ہستی کیا ہے
فقط سرکار کے اشارے کی دیر ہے۔ جس وقت حکم دیجئے لا کر حاضر کر دوں،
بھلا سرکار کا حکم اور رعیت ٹال دے۔"

کوتوال۔ میں نکاح کا خواہشمند نہیں ہوں اور نہ مجھے ایسی ضرورت کیا
پڑی ہے کہ اپنے خاندان پر بٹہ لگاؤں، نکاح کرنا چاہتا تو نصیر کو ابھی مروا دیتا
میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ چند گھنٹوں کے واسطے یہاں آجائے نصیر

آج صبح بنگالہ بھیج دیا گیا۔ اب مطلع صاف ہے تو شوق سے جا۔

مشاطہ۔ لیکن سرکار بڑھیا بڑی گھاگ ہے۔ پھر وہی عذر کرے گی۔

کوتوال۔ تو کیا تیرا یہ مطلب ہے کہ میں خاموش ہو جاؤں۔

مشاطہ۔ لونڈی یہ عرض نہیں کر سکتی ہاں یہ ضرور کہوں گی، اس سے زیادہ قبول صورت لڑکیاں ایک سے ایک بڑھی چڑھی دیکھنے دکھانے کے لائق ہیں حکم ہو تو ایک نہیں پچاس حاضر کر دوں،

کوتوال۔ کم بخت کٹنی! میرا نام جانتی ہے! سعد اللہ خاں آج اگر چاہوں تو محل کی جس شہزادی کو حکم بھیج دوں فوراً حاضر ہو جائے۔ ان بھک منگیوں، فاقہ زدوں کی جن کو روٹی تک نصیب نہیں، مجال کیا ہے کہ میرے حکم سے باہر ہو سکیں، کیا وہ نہیں سمجھ سکیں کہ میں کوتوال نہیں بادشاہ ہوں، میرا سکہ تمام اکبرآباد پر چل رہا ہے، میں شہر کے ایک ایک دل سے واقف ہوں رعیت میرے نام سے لرز رہی ہے وہ جابر و سرکش پٹھان جو اپنے آگے کسی کو سمجھتے ہی نہ تھے جیلخانہ میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ روپیہ سب سے بڑی چیز ہے، یہ زر و جواہر لے جا دیدے، فقیرنیوں کی آنکھیں کھل جائیں گی بد نصیب نے کبھی خواب میں بھی اشرفی نہ دیکھی ہوگی، ایک مہینہ کی مصیبت میں چار روپے نصیر کو میسر آتے ہیں، اس کی بیوی کی تقدیر یہ کہ میرے پاس جگہ پائے، جا یہ دیدے اور کہہ کہ تھوڑی دیر کے واسطے شب کو حاضر ہو۔

(۴)

"ستو اور گڑ تھیلی میں بھر دئے تھے۔ بیس دن تو چل ہی جائیں گے، دریا بھی تو تین تین لانگنے ہیں، اللہ کرے پاٹ زیادہ نہ ہو، کتنے تھے اگر پانی

پھر تھا؟ پرنہ ہوا تو اللہ چاہے اکیسویں یا بائیسویں روز پہنچ جاؤں گا۔ فقط آٹھ دن وہاں ٹھہرنا ہے اُلٹے ہی پاؤں آؤں گا۔

ماں ۔ اری بیٹی بنگالہ کیا یہاں رکھا ہے۔ کالے کوسوں جانا اور آنا پھر سفر کا معاملہ کہنے کو بیس دن ہیں، دکھ بیماری چوٹ پھینٹ ہزاروں باتیں ہیں اللہ اسی خوشی سے گھر لے آئے تو جانوں کے آگئے،

بیٹی ۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے آجتک کبھی ایسی نوکری نہ لگی تھی، دو دو تین تین دن کو تو چلے جاتے، مگر یہ مہینوں کی مصیبت پہلے کبھی نہیں آئی ۔

ماں ۔ تنخواہ کو کہہ گئے مجھے کہ تم جاکر کوتوال صاحب سے لے آنا ۔ میں گاڑی والے سے کہہ چکا ہوں، آج دن بھر یہی سوچتی رہی، مگر میری تو ہمت نہیں پڑتی پھر خیال آتا ہے کہ نہ جاؤں گی تو کھاوینگے کیا، آٹا تو صبح تک کا اور ہے دال بھی ختم ہوگئی، لاؤ کل چلی جاؤں ۔

بیٹی ۔ جانا ہے تو پھر آج ہی ہو آؤ، ابھی عصر کی اذان بھی نہیں ہوئی، جاؤ گاڑی والے کو دیکھ لو ہو بھی یا کہیں گیا ہوا ہو، اگر اب چلا چلے تو خیر نہیں تو اس سے پوچھ لو کہ کب لیجائیگا، وہ بھی کوئی نوکر تو ہے نہیں، اپنے پیٹ کے دھندوں سے چھٹکارا ہوگا تو تمہارا کام بھی کردیگا ۔

بیوی سلام،

سلام ہوا! آپ کیسے آئیں؟

مشاطہ ۔ لیجئے یہ کشتیاں اُتروایئے، چار ہیں ایک اشرفیوں سے لبریز ہے ہزار اشرفیاں فقط منہ دکھائی کی ہیں ایک میں زربفت و کمخواب کا کارچوبی جوڑا ہے، ایک میں صرف سونے کا زیور اور ایک میں نقد روپیہ،

خدا کی شان دیکھو سارا اکبرآباد تو کوتوال کی مٹھی میں ہے، لوگ صبح سے شام تک

اس انتظار میں کہ کوئی حکم ملے تو تعمیل کریں رئیس اور نواب اور امیر اور جاگیردار بیٹیاں دینے کو حاضر اور کوتوال کا دل آیا تو کہاں، وہی کہاوت ہے راجہ کے گھر آئی رانی کہلائی، لو بیوی تم کو مبارک کرے، نہا دھو کر جوڑا بدلو، زیور پہنو، اور تھوڑی دیر کے واسطے چلی چلو، کیا تقدیر جاگی ہے واہ واہ اسے کہتے ہیں مقدر کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری گھر بیٹھے خدا یوں چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ایسی ایسی لڑکیاں سعد اللہ خاں کے دربار میں سینکڑوں آتی ہیں مگر وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ایک اس جوڑے اور گہنے پاتے ہی پر الامال کر دیگا دولت پھاوڑوں کاٹے کٹے ہی گی نہیں دھکے دو گی اور نہ نکلے گی، اور میاں کیا نرا سپاہی رہیگا۔ ارے بی اس کو تو سمجھ لو کہ تھانہ دار ہو گیا اور یہ دیکھو سعد اللہ خاں فرشتہ آدمی ہے فقط صورت کا بھوکا۔ اسے اور کچھ نہیں چاہیئے، بس دور سے سلام کر دینا بیٹھا بیٹھا اپنے گھر آجاؤ۔"

پٹھانی کو تاب نہ رہی۔ حمیت کی آگ پر کباب کی طرح بھن رہی تھی، بید کی مانند تھر تھر کانپنے لگی منہ سے کف جاری ہو گئے آنکھوں میں خون اتر آیا، نشتر افلاس نے زخم عصمت پر کچوکے دیئے، ہوش و حواس کی قربانی کا وقت تھا۔ لیکن بڑھیا آگے بڑھی تجربہ نے دنیا کے نشیب و فراز دکھا دیئے تھے اور عمر کی منزلوں نے حاکم و محکوم کا رشتہ بتا دیا وقت نازک تھا، اور موقعہ خطرناک، خاندانی جواہر ریزے خاک میں مل رہے تھے اور ایک بچی بچائی دولت جس کو مدتوں کلیجہ سے لگا رکھا تھا آج وہ بھی زبان نشاط کے ڈاکو چھین رہے تھے پھر بھی صبر کے قدموں سے سامنے آئی اور دوراندیشی کی زبان سے کہا:۔

"بی بی غریب ہیں فقیر ہیں، ہم کو نہ ستاؤ، کوتوال صاحب کی دولت ان کو مبارک ہو ہم سوکھے ٹکڑوں میں خوش اور فاقوں میں رہنے والے لوگ اس زر و جواہر کی قدر کیا جانیں ہمارا تقدیر ایسی نہیں ہے، ہم کو تو یہ میلے کچیلے کپڑے لہسن کی چٹنی اور پیاز کی گٹھیاں زر و بافت و کمخواب ہیں خدا کا واسطہ ہم پر رحم کرو اور کوتوال صاحب سے کہدو کہ

رعیت کی بہو بیٹیاں اپنی ہی بہو بیٹیاں ہوتی ہیں۔ ہم ایک کو نہیں پڑے ان کے جان و مال کو دعا دے رہے ہیں وہ ہم پر رحم کریں خدا ان پر رحم کرے گا۔"

(۵)

"اس کم بخت کو یہ نہیں معلوم کہ میں کون ہوں، دم بھر میں تمام اکبر آباد کو غارت و برباد کر سکتا ہوں اُٹھی مٹھی چنوں کو ترسنے والی لونڈیاں جن کو روٹی نصیب نہ کپڑا عصمت کے پچھلے لگا کر بیٹھی ہیں، عورتیں ہیں سمجھتی نہیں کہ سعد اسد خاں کیا چیز ہے یہ وہ تلوار ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے، یہ تیرے سامنے میان سے باہر ہوتی ہے اور اس وقت تک اب میان میں نہ کروں گا جب تک دونوں ماں بیٹیاں قدموں پر سر نہ دھرلیں ان کے سر یا ان قدموں پر ہوں گے یا اس تلوار پر، کوئی مرد ہوتا تو اس کو ٹھیک بناتا، عورتوں پر کیا ہاتھ اُٹھاؤں، جا اور کہدے کہ آج رات کو آدھی کے قریب سعد اسد خاں کی سواری تمہارے گھر پر آئیگی، اگر جان کی امان لینی ہے تو اس کے حکم کی تعمیل کرو، ورنہ کل ہی زن بچہ کو لھو میں پلوا دوں گا، نصیر راستہ میں ہمارے حکم سے قتل کر دیا گیا، اور آج سب سے پہلے یہ تلوار جس کا سر تن سے جدا کرے گی وہ اس کا بچہ ہوگا، ایک برقنداز کی عورت چار روپے ماہوار کے ملازم کی بیوی اور ماں کی یہ مجال کہ میرے حکم کی تعمیل سے انکار کریں، قضا نصیر کے سر پر کھیل رہی تھی، کہدے بچوا بھی ایک ہی مرا ہے، لیکن سعد اسد خاں کی تلوار گھر بھر کا صفایا کر دے گی، میں خود ایسی غریب مفلس عورتوں پر نہیں تھوکتا، مگر کیا کروں میرا دل بےچین ہے اور جس قدر دیر ہو رہی ہے میری حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ آج دن بھر مچھلی کی طرح تڑپا ہوں اور خدا خدا کر کے شام ہوئی تو تو یہ جواب لائی، جا۔ ابھی جا اور اطلاع دیدے۔"

مشاطہ فضائے اُمید میں ظلم و ستم کے پیروں سے اُڑی اور آناً فاناً منزل مقصود پر پہنچ گئی بارہ گھنٹہ کا پہاڑ سا دن دونوں ماں بیٹیوں نے پانی کے سہارے

پر گذار دیا تھا مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر دونوں نے سلام پھیرے تو یہ حکم پہنچا
بڑھیا۔ اچھا بی اچھا، جب ہماری تقدیر میں یہ ہی لکھا ہے تو اس کا مٹانے
والا کون ہے؟ خدا مالک ہے وہی ہماری مدد کریگا اور ظالم کے پنجے سے بچا لیگا۔

(۶)

گیارہ روز کا تھکا ہارا جہانگیر اب ہی شکار سے واپس ہوا ہے **نور جہاں بیگم** اپنے ہاتھ سے دسترخوان چن رہی ہے اور بادشاہ کی محبت آمیز نظریں بیگم کے حسن پر پڑتی ہوئی سلیقہ شعاری کی خاموش داد دے رہی ہیں، کھانا آراستہ ہوگیا، شہنشاہ دسترخوان پر بیٹھے، مزاج خوش تھا، بیگم نے عرض کیا۔

جہاں پناہ! اقبال شاہی سے تمام اعزاز و اکرام کنیز کو میسر ہو چکے ہیں لیکن ایک ارمان باقی ہے اس کو بھی پورا کر دیجئے"

بادشاہ۔ بیگم! سلطنت ان جگر دوز آنکھوں پر قربان ہو چکی جو چاہو خود کرنا مجھ سے مشورہ کی ضرورت کیا ہے۔

دفعتہً قلعہ کے دروازہ پر کسی فریادی کی گھنٹی بجی اور بادشاہ کھانا چھوڑ چھاڑ نوالہ منہ میں لئے کھڑے ہوئے۔ بیگم کی تیوری پر بل آگیا مگر اتنی طاقت نہ رکھتا تھا کہ بادشاہ کے پاؤں میں زنجیر بن کر پڑ جاتا۔

رات کا ابتدائی حصہ ہے، شہنشاہ جہانگیر تن تنہا قلعہ کے دروازہ پر کھڑا ہے ایک سپید چادر میں لپٹی ہوئی عورت سامنے آئی، اس کی آواز غصہ میں کانپ رہی تھی اور آنکھ سے آنسو گر رہے تھے، چاہتی تھی کہ ضبط کرے مگر نہ کر سکی اسی حالت میں کہا۔

"شراب کے شوق اور بیگم کی محبت نے تجھ کو رعیت سے غافل کر دیا اکبر کی ہڈیاں گل کر خاک ہو چکیں، مرنے والا باپ تجھ کو اس لئے سلطنت نہ دے

گیا تھا کہ تو خدا کی مخلوق سے بے خبر ہو جائے، کچھ خبر ہے۔ رعیت پر کیا گذر گئی اور کیا گذر رہی ہے، میں تیری رعیت کی ایک ادنیٰ کنیز اور معمولی برقنداز کی ماں ہوں، ہم دو ماں بیٹیاں ایک کونہ میں پڑے تیرے جان و مال کو دعا دے رہے ہیں، میں ایسے شخص کی بیوی ہوں جس نے تیرے باپ کو اور تجھ کو دونوں کو گودیوں میں کھلایا کل کی بات ہے کہ تو بے زبان و مجبور ہماری گود میں تھا آج تو اس سرزمین کا شہنشاہ ہے لاکھوں بندگان خدا کی عزت و آبرو کا مالک اور عصمت و عفت کا نگہبان۔ ہم دو ماں بیٹیوں پر آج بارہ گھنٹے کا دن فاقہ سے بسر ہوا، مگر آج تیرا کوتوال جو اپنی کوششوں میں ناکام اور دولت کا لالچ دیکر بھی مایوس ہو گیا۔ ہمارے شیشۂ عصمت کو بالجبر چکنا چور کرتا ہے۔ میرا بے گناہ بچہ نصیر قتل کر دیا گیا۔ میں اس کی مدعی نہیں ہوں ہماری عصمت تیرے کوتوال کی اور تیری نگاہ میں بے وقعت ہو اس لئے کہ ہم تیری اور اس کی رعیت ہیں مگر تیرے کوتوال کی دولت تیرا خزانہ تیری سلطنت ہماری جانیں ہمارے مال ہماری اولاد تو اور تیری بیگم سب اس پر قربان ہو جائیں تو بادشاہ ہے ہمارا محافظ، صرف اتنا موقع دلوا کہ آج کی رات اکبر آباد میں بسر کر لیں، اور یقین کر کہ صبح کا نکلتا ہوا آفتاب ہمارے سروں پر تیری سرحد سے دور چمکے گا۔ اور ہم صبح صادق سے قبل اکبر آباد سے غارت ہو جائیں گے،

جہانگیر! ڈر! ڈر! جہانگیر! ڈر بادشاہی ہمیشہ رہنے والی نہیں اس نے ہمایوں اور اکبر دونوں کو گہری نیند سلا دیا۔ یہ تجھکو بھی چھوڑنے والی نہیں لیکن آج ہماری عصمت اگر برباد ہو گئی تو آرہا ہے وہ وقت جب تیری بادشاہی اور ہمارا افلاس برابر ہوں گے ایک حقیقی بادشاہ کے روبرو میری بچی

کی عصمت کا خون تیرے دامن پر ہو گا۔ سوچ اور غور کر کیا وقت ہو گا۔ بچا جہانگیر بچا میری بچی کو ظالم کے ظلم سے، اپنے کوتوال کے پنجہ سے اپنی حکومت کے انجام سے، اپنی مملکت کے انتظام سے!"

(۶)

وہی دو ماں بیٹیوں کا بوسیدہ گھر اور وہی رات کا وقت ہے جہانگیر ایک کیکر کے درخت کے نیچے زار و قطار تنہا رو رہا ہے، کوتوال صاحب کی سواری پہنچی، مشکی گھوڑے پر سوار تھے برہنہ تلوار ہاتھ میں تھی، مکان کی دیواریں بلند نہ تھیں گھوڑے سے چھت پر اور چھت سے نیچے اب جہانگیر اٹھا سائیس سے کہا گھوڑا اسی طرح دیوار کے پاس لگا دے سائیس نے پہلے انکار کیا مگر جب صورت پہچانی تو بیہوش ہو کر گر پڑا اور جہانگیر گھوڑے پر چڑھ کر اسی طرح مکان میں اتر ا ایک کونہ میں چھپ گیا جب عصمت کی دیوی کسی طرح رضامند نہ ہوئی تو ظالم کوتوال نے تلوار ہاتھ میں تولی بچہ کو گود سے گھسیٹا۔ چاہتا تھا کہ قتل کر دے دفعتہً شہنشاہ جہانگیر کے یہ الفاظ کان میں پہونچے، "بس سعد اللہ خاں چھوڑ دو"!

بدن میں رعشہ پڑ گیا، اشرفیوں کی ایک تھیلی کھانے کا ایک خوان ساتھ میں تھا، کوتوال کی مشکیں باندھیں اور روتا ہوا ان دو ماں بیٹیوں سے اپنی تقصیر غفلت کے عفو کا طالب ہوا، کھانا کھلایا، اشرفیاں پیش کیں اور علی الصباح سعد اللہ خاں کو پھانسی دیدی،

خیری صاحب! تم ان باتوں کو کیا جانو، تم تو بس یہ ہی رٹتے جاؤ کہ

ؐ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا، ستمگر تھا۔

ملکه شهرزاد

سرزمین طرابلس سے ملکہ شہزادہ ایک ایسی عورت اٹھی کہ دنیا اس کا نام قیامت تک فراموش نہیں کر سکتی، وہ خاندان حلیمی کے چوتھے حکمراں احمد پاشا کی بیوی اور اسفندیار جنگ کی اکلوتی بیٹی تھی، شادی کے بعد یہ مشکل ایک مہینہ ایسا گذرا ہوگا، کہ میاں بیوی ہنسی خوشی اپنا وقت گذار سکیں ورنہ احمد پاشا جو ایک فرشتہ صفت انسان اور عدل کا پتلا بادشاہ تھا، شہزاد جیسی بیوی کے ہاتھوں زندگی سے بیزار ہوگیا، تاریخ اس والی حکومت کی زندگی اس طرح بیان کرتی ہے۔

(۱)

دنیا اپنے چہرے پر رات کا برقعہ ڈال چکی تھی، آسمان کی گود تاروں سے بھری ہوئی تھی چاندنی قصر احمدی پر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی شہزاد اپنی مسہری پر لیٹی کسی خیال میں محو تھی، خواصیں ہاتھ باندھے حاضر تھیں، کہ احمد بادشاہ بارہ دری میں داخل ہوا، در دسر کی وجہ سے اس کی طبیعت بے چین تھی اور اشد ضرورت تھی، کہ چند لمحے کے واسطے اس کو سکون میسر ہوتا۔

وہ جواہر نگار مسہری پر آکر بیٹھا، خواصیں باہر گئیں، اور اس نے آہستہ سے کہا۔

بیگم! درد سر نے بہت پریشان کر رکھا ہے، حکیم دوائیں بدل چکے، مگر درد کم نہیں ہوتا،

شہرزاد۔ پھر میں کیا کر سکتی ہوں،

احمد۔ کچھ نہیں! میں تم سے کسی بات کا متوقع نہیں ہوں، یونہی ذکر کر دیا تھا،

شہرزاد۔ ذکر کی ضرورت ہی کیا تھی، خواہ مخواہ مجھ کو پریشان کیا،

احمد۔ بیگم! مجھے تکلیف زیادہ ہے کیوں بحث کرتی ہو، اتنی مہلت دو، کہ میں اطمینان سے تھوڑی دیر لیٹ رہوں،

شہرزاد۔ تو یہ زیادہ اچھا ہوگا کہ تم باہر جا لیٹو یہ کیا ضرورت ہے کہ میرے ہی سر پر رات بھر ہائے ہائے کرو اور میری نیند بھی برباد کرو۔

احمد۔ اچھا میں چلا جاؤں۔

شہرزاد اچھی بات ہے۔

بادشاہ کو تکلیف زیادہ تھی وہ اس کا جواب نہ دے سکا، اُٹھ کر باہر چلا گیا درد معمولی تھا تھوڑی دیر میں جاتا رہا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب آنکھ کھلی غسل کیا لباس تبدیل کر کے زنانخانہ میں آیا تو شہرزاد باغیچہ میں گلگشت کر رہی تھی بادشاہ بھی اُدھر ہی چلا گیا، مگر جب ملکہ نے مطلق توجہ نہ کی، تو کہنے لگا۔

"تم کو میرے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی"۔

شہرزاد۔ نہ کیوں ہوتی،

احمد۔ تم تھوڑی دیر کے واسطے بارہ دری میں چلو تو میں

کچھ باتیں کروں، اس کے بعد دربار میں جاتا ہے۔
شہزاد۔ جو کچھ کہنا ہے، یہاں کہہ سکتے ہو،
احمد۔ یہ سن کر ایک تعجب آمیز نظر جس میں حسرت و ملال شامل تھا، شہزاد کے چہرے پر ڈالی اور رخصت ہوا۔

شہزاد کی روزانہ زندگی کا یہ ایک واقعہ تھا، اس نے اس حالت میں کبھی بادشاہ کو رضامند کرنے کی کوشش نہ کی، اس لاپروائی اور نخوت پر جو شہزاد کرتی تھی بادشاہ وقت اس کی دلداری میں مصروف رہتا تھا۔

شہزاد جو اس وقت ایک بادشاہ کی ملکہ اور لاکھوں بندگان خدا کے حکمراں کی بیگم تھی شوہر سے کم انسانیت کا برتاؤ کرتی،

احمد پاشا باوجود دنیا کے تمام عیش و آرام کے بیوی کی طرف سے رات دن متفکر رہتا، اس نے وزیروں اور مشیروں سے ہرچند مشورہ کیا، مگر یہ کانٹا اس کے دل میں ایسا چبھا کہ کسی طرح نہ نکلتا،

(۳)

جب زمانہ نے احمد کی اقبال کا ورق الٹ دیا، سلطنت برباد اور رعیت ناشاد ہوگئی، اور بالآخر وہ وقت آیا کہ احمد بادشاہ ادہم کے حضور میں پابہ زنجیر حاضر ہوا۔ اور وزیر اعظم نے یہ حکم سنایا

شہنشاہ والاحشم سلطان المعظم حضور ادہم پاشا کے حکم سے تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ تاج ایران نے اپنے بیش بہا سردار اور بہادر فوج قربان کرنے کے بعد تمہاری سلطنت کو فتح کرلیا اس سرزمین

کا چپہ چپہ اور رعیت کا ہر شخص سلطان ادہم کی ملکیت
ہے اگر تم ملکہ شہرزاد کو جو ابتک تمہاری بیوی تھی طلاق
دے کر ادہم پاشا کی خدمت میں پیش کرو، تو سزائے
موت جو تمہارے واسطے تجویز ہوئی ہے، معاف
ہو گی، ورنہ دو گھنٹے بعد جلاد تمہاری گردن تن سے جدا
کر دے گا۔

احمد پاشا جو ایک دن پہلے اس سلطنت کا حکمراں تھا، اس
وقت قیدی بنا کھڑا تھا، ملکہ شہرزاد کا نام سنتے ہی تن بدن میں آگ
لگ گئی، وہ شہرزاد کا عاشق تھا، مگر یقین تھا کہ شہرزاد میری صورت
سے متنفر ہے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا، ایک ٹھنڈا
سانس بھرا اور خاموش ہو گیا،

احمد پاشا کی خموشی نیم رضا سمجھی گئی، اور حکم دیا گیا، کہ وہ
آزاد ہو۔

احمد پاشا محل کی درو دیوار کو تکتا باہر نکلا دروازہ ہی میں
تھا کہ ادھر سے ملکہ شہرزاد آتی ہوئی دکھائی دی، فوج کا ایک
دستہ جلو میں تھا، حسرت آمیز نظر سے دیکھتا رہا، کوشش
کی کہ بات کروں مگر شہرزاد کی سرعت رفتار نے ناکام رکھا،
اور وہ آناً فاناً نظروں سے غائب ہو گئی،

(۳)

رات اپنی منزل کا آدھا حصہ طے کر چکی تھی قصر احمدی روشنی
سے جگمگا رہا تھا اور ملکہ شہرزاد اس کے برابر ایک کرسی پر جلوہ افروز

تھی دفعتاً ادہم پاشا کھڑا ہوا اس کا شانہ پکڑا اور کہا۔

"ملکہ صرف تمہارا نام اور اس کی سچی کشش مجھ کو یہاں تک لائی ہزارہا بندگان خدا کی جانیں اس صورت پر قربان ہوئیں، میں صرف تمہاری پرستش کرنے آیا ہوں"

شہرزاد یقیناً تم انسان نہیں حیوان ہو، کہ ایک منکوحہ عورت کی عزت تمہاری رائے میں کوئی وقعت نہیں رکھتی، میں احمد پاشا کی بیگم نہیں۔ اس کی لونڈی ہوں، وہ شوہر نہیں میرا دنیاوی خدا ہے آج کہ احمد پاشا فقیر ہے، جو روح سب سے پہلے اس پر نثار ہوگی وہ شہرزاد ہوگی اور یہ ایسا فخر ہوگا جو لاکھوں کروڑوں بیویوں میں ایک کو میسر ہوتا ہے۔

ادہم، بدنصیب عورت! جس شخص کو آج بھیک بھی میسر نہیں ہے، تو محض اس کی وجہ سے اپنی تمام امیدوں کو برباد کرتی ہے، اپنی جان سے بیزار نہ ہو، یاد رکھ، کہ تو اپنے ساتھ احمد کو بھی ہلاک کرے گی۔

شہرزاد۔ مجھے اس سے زیادہ کیا خوشی ہوسکتی ہے، کہ میں اپنے عزیز شوہر پر نثار ہوجاؤں، اے مکار، کمینے، تیری مائیں، بہنیں، بیٹیاں کیا ایسی ہی بے عزت ہیں کہ عصمت کی جو اُن کے پاس شوہر دل کی امانت ہے، مطلق عزت نہیں کرتیں،

ادہم۔ شہرزاد اپنی زبان روک اور اس سلطنت کی مالک بن ورنہ دو دو دانوں کو تنہا پھرے گی۔

شہزاد۔ دنیا کے کتے سامنے سے دور ہو جا، اور اپنی آواز
نہ سُنا۔

ادھر بادشاہ اتنا سنتے ہی بے تاب ہو گیا، اور حکم دیا کہ شہزاد
کی آنکھیں تلووں سے مل دو، حکم کی تعمیل ہوئی، دیکھتے ہی دیکھتے شہزاد
کا چہرہ لہولہان ہو گیا آنکھیں تلووں سے مل دی گئیں اور اسی حالت
میں تڑپتی پھڑکتی، جدھر منہ اٹھا روانہ ہو گئی۔

(۴)

عراق کے گھنے جنگلوں کا جہاں چاروں طرف شیر بھیڑیے
ڈہاڑتے رہتے احمد پاشا مہمان تھا۔ دن اس کے سر پر شام
ہوتے راتیں اس کی آنکھوں میں صبح ہوتیں، درندے اس کے پاس
سے نکل جاتے اور سانپ اس کے برابر پھنکار مارتے مگر اس سخت جانی
کا کسی طرح خاتمہ نہ ہوتا، شہزاد جیسی بیوی کی بے وفائی نے اس کو دیوانہ
بنا دیا وہ انقلاب کی سچی تصویر تھا، جو شخص گل پھولوں کی سیجوں پر
آرام کرتا چیں بہ جبیں ہوتا تھا، آج جنگل کے کانٹے اس کا بچھونا، اور
وادی ایراہیم اس کا مسکن تھا، وہ اس درجہ شہزاد کے خیال میں محو
تھا کہ ہر چیز میں اس کو وہی نظر آتی، جدھر آنکھ اٹھاتا وہ، جس پر نظر
ڈالتا وہ یہاں تک کہ درختوں کو مجسم شہزاد سمجھ کر گھنٹوں شکوہ کرتا، اور
پاؤں پر گرا رات رات بھر پڑا روتا،

چار چار، پانچ پانچ روز اس طرح گذر جاتے کہ اناکر دانہ اس کے منہ
میں نہ جاتا، وہی جنگل کی گھاس پتی یا زیتون اس کا دسترخوان تھا بھوک
زیادہ پریشان کرتی تو ادھر متوجہ ہوتا، مگر ادھر حلق سے کوئی چیز اتری،

اور ملکہ کا خیال آتے ہی ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

(۵)

"احمد پاشا اپنی بیوی نہیں گنہگار لونڈی کا قصور معاف کرنا میرے سرتاج میں سرتا سر خطاوار ہوں مجھ پر رحم کی نظر رکھنا!"
سمندر کی لہریں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں موسم برسات کا تھا، اور آدھی رات کے وقت موسلا دھار بارش میں جب سیاہ گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی تھی، یہ الفاظ ہوا میں گونج رہے تھے۔
عفت و عصمت کا جوہر بے بہا، ملکہ شہزادا اپنے عزیز شوہر کی یاد میں تڑپ رہی تھی، اس کے گلابی رخسار زرد ہو چکے تھے اور لمبے لمبے سیاہ بال جوگنوں کی لٹیں بنے ہوئے تھے، آنکھیں جو جلاد کی عنایت سے بچ گئی تھیں گڑھوں کی نذر تھیں اور یہ سچ مچ کی حور اس وقت وحشیوں سے بدتر ایک گھنے اور تناور درخت کے نیچے بیٹھی صدا لگا رہی تھی مینہ اس کے سر پر تھا، بجلی چمک رہی تھی، بادل کڑک رہا تھا، اور کوئی آسمانی طاقت ایسی نہ تھی، جو اس بے ہوش کو ہشیار کر دے اپنے رفیق و عزیز شوہر کو یاد کرتے کرتے اس جلاد کا شکریہ ادا کرتی، جس نے اس کی آنکھوں کے بدلے کسی جانور کی آنکھیں مسل دیں، اور پھر احمد احمد کہتی دوڑتی اور گر پڑتی۔

(۶)

جب قاچاری سلطنت کا چراغ گل ہو گیا، اور مظفر تخت ایران پر جلوہ گر ہوا۔ تو مدت کی دبی ہوئی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی، وہ آندھی کی طرح اڑا، اور بجلی کی مانند ادھم پر آکر گرا، ایک خونریز معرکہ کے بعد جس نے سرزمین طرابلس کو خون میں نہلا دیا، مظفر فتحیاب ہوا

اور زمانہ نے اس کی حکومت کا ڈنکہ چاروں طرف بجادیا، اس معرکہ کو ایک ہفتہ گذرا ہوگا، ایک روز دوپہر کے وقت جب مظفر شکار سے واپس آرہا تھا، اس نے کنارہ دریا سے یہ آواز سنی۔

"آسمانی بادشاہت والے بادشاہ احمد کی کنیز کو اس کے سرتاج کی صورت دکھا دے!"

موسم گرم تھا، لو کے تھپیڑے زور شور سے چل رہے تھے، یہ صدا کچھ ایسی درد انگیز تھی، کہ بادشاہ گھوڑا بڑھا کر ادھر آیا کہ حقیقی بہن جس کا وہ آٹھ روز سے متلاشی تھا، اپنے شوہر کے فراق میں دیوانوں کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دینے پر آمادہ ہے، اترا اور قریب جا کر کہا!

"شہزادی کیا حال ہے؟"

بھائی کی آواز سنتے ہی نگاہ اٹھائی اور صورت دیکھتے ہی چیخ مار کر لپٹ گئی۔ دونوں بھائی بہن دیر تک ساون بھادوں کی طرح گلے مل کر روتے رہے۔ رو چکے تو مظفر نے بہن سے مفصل کیفیت بیان کی، ادھم کا زوال سن کر شہزادی کے چہرے پر آج برسوں کے بعد مسکراہٹ آئی، مگر یہ سن کر کہ احمد پاشا کا پتہ کہیں نہ چلا، اور غالباً وہ رخصت ہوا، ملکہ کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، ہر چند مظفر نے سنبھالا، مگر اس خبر نے ایسا بے قابو کیا کہ وہ نہ سنبھل سکی، اور بے ہوش ہوکر گر پڑی، بہن کا سر مظفر نے اپنے زانو پر رکھا، اور اس پیاری صورت کو جو انقلاب زمانہ پر قربان ہو چکی تھی ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا، دامن کا پنکھا جھلا رومال بھگو کر سر پر رکھا، مگر بدنصیب بیگم کو ہوش نہ آیا۔

آفتاب غروب ہونے کے قریب پہنچا اور جنگل بیابان میں جہاں سمندر زور و شور سے لہریں لے رہا تھا، چاروں طرف اندھیرا چھا گیا، شیر بھیڑیئے ڈہارنے لگے اور ہوا نے فرّاٹے بھرنے شروع کئے شہزاد کسمسائی، اور آنکھ کھولی، بھائی نے فرطِ محبت میں پیشانی کو بوسہ دیا بھائی کی اس شفقت نے بہن کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گلے میں ہاتھ ڈال لپٹ گئی، اور کہا۔

"میرے ماں جائے بادشاہ میں تیرے قربان"

بہن کے یہ الفاظ سن کر مظفر بے تاب ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا:

"ماں جائی جنگل کی زندگی بسر ہو چکی اب اپنے محل میں چلو"

مظفر کی درخواست ایسی نہ تھی کہ شہزاد انکار کرتی دونوں بہن بھائی گھوڑے پر سوار ہوئے اور قصرِ احدی پر پہنچے۔

(۷)

سرزمین طرابلس جس کے چپّہ چپّہ پر گذشتہ پانچ سال میں خون کے دریا بہے، آج چوتھی کی دلہن بنی ہوئی ہے تمام شہر روشنی سے جگمگا رہا ہے اور اعلان ہوا ہے کہ ملکہ شہزاد بیوہ احمد پاشا آج تختِ طرابلس پر جلوہ افروز ہوگی، سب سے پہلے فاتح ملک مظفر شاہ نے ملکہ کے حضور میں نذر دی، اور اس کے بعد باری باری امرا رؤسا نے مجرا کیا۔

چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ گذرا۔ ملکہ شہزاد کاروبارِ سلطنت انجام دیتی ہو، مگر کھانا پینا تھک چکا، عیش و آرام چھوٹ گیا، جاگتی ہے تو

احمد کی تصویر، سوتی ہے، تو احمد کا خیال، ساری رات آنکھوں میں بسر ہو جاتی، اور پورے پورے دن ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے ختم ہو جاتے، صحرائی زندگی پھر غنیمت تھی کہ روزانہ جاتی پھرتی۔ روتی پیٹتی، اب دل کی بھڑاس بھی نہ نکلتی، بارہ دری کو دیکھتی، تو آنسو اُمنڈ آتے اور پی جاتی، ہڈیوں کی مالا رہ گئی۔ کھڑی ہے تو ساکت بیٹھی ہے تو تصویر، قدرت انسان کے ہر رنج کو خواہ وہ کتنا ہی صدمہ کیوں نہ ہو، رفتہ رفتہ گھلا دیتی ہے مگر شہزاد کی حالت بجائے سنبھلنے کے روز بروز بگڑتی گئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ چمن کے ان درختوں کو جو احمد پاشا کے پیارے تھے ان پھولوں کو جو اس کے شوق کے لگائے ہوئے تھے جا جا کر چومتی اور روتی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ چودھویں رات کا چاند سطح آسمان پر اٹکھیلیاں کر رہا تھا، شہزاد احمد کی یاد میں بے قرار ہو کر باہر نکلی، اس کو اپنی حالت کا مطلق ہوش نہ تھا، چاند اس کے کلیجہ پر چھریاں چلا رہا تھا ہر چند کوشش کرتی تھی، مگر دل کسی پہلو چین نہ دیتا تھا، ایک تارے کو دیکھا کہ ٹکٹکی باندھے اس کی صورت کو دیکھ رہا ہے سمجھی کہ احمد کی پاک روح ہے اس خیال نے یقین کی صورت اختیار کی، اور تارے کے پیچھے روانہ ہوئی مشتری چمک چمک کر لرز رہا تھا اور شہزاد تڑپ تڑپ کر بڑھ رہی تھی رات اسی جستجو میں ختم ہوئی، اور جب ملکہ آذر پہاڑ کی حدمیں تھی، تارے کی چمک دمک ماند پڑ ی پاؤں چھلنی ہو چکے تھے، اور کانٹوں نے اپنے نازک مہمان کے تلوے لہولہان کر دئے تھے، مایوس ہو کر بیٹھ گئی، اور دیکھتی رہی کہ وہ مشتری

جس کی آب وتاب چاند کو شرما رہی تھی، ماند ہوتے ہوتے نظروں سے
اوجھل ہو گیا زیتون کا درخت جس میں پرند کا گھونسلا تھا سر پر چھپا یا
ہوا تھا، بلبل طرابلس کا پیغام صبح ہوا میں گونجا، پو پھٹ رہی تھی اور
رات پورو کر دن سے جدا ہو رہی تھی صبح کا سہانا وقت تھا پہاڑ
کی چوٹی پر سے اس سنسان وقت میں یہ صدا آئی۔

"ملکہ شہزادا اپنے محبوب ادہم کا صدقہ ایک دفعہ صورت
دکھا دیجئے"

آواز کے کان میں آتے ہی شہزادی تڑپ اٹھی، اور پہاڑ پر چڑھی دیکھتی کیا
ہے کہ ہڈیوں کا ایک ڈھیر پہاڑ کی چوٹی سے گرنے کا قصد کر رہا ہے
یہ وہ صورت تھی، جس کی دیوانی تھی چکر آیا مگر سنبھلی آگے بڑھی، دل
چاہتا تھا کہ پاؤں میں گروں، مگر حیا روک رہی تھی، احمد کی صورت ایک
ایسی نعمت تھی کہ رات بھر کی زحمت وصول ہو گئی، آنکھ سے آنسو گرنے
لگے، شملہ پر کھڑی تھی کہ گوشت کے لوتھڑے سے پھر یہ آواز نکلی۔

"ادھم کی بیگم! ملکہ شہزادا! آخری وقت ہے، میرا قصور معاف کیجیو"

جنگل بیابان، ہوا کا فراٹا، صبح کا سہانا سماں اور شہزادی جیسی بدنصیب بیوی
حسرت نصیب دل ایک نازک وقت تھا جس صورت کی عاشق زار
اس شوہر کی فرمانبردار جس مالک کی جدائی میں خدائی خوار تھی، بارہ برس بعد
جب سب طرف سے مایوس ہو گئی، تو اس کی شکل اس حال میں نظر آئی کہ
گر کر اپنی جان کھو رہا ہے، خاموش کھڑی سکتے کے عالم میں تھی کہ احمد کھڑا
ہو کر گرنے کو تیار ہوا، پیچھے سے دو ہاتھوں نے اس کو پکڑا اور احمد نے
صورت دیکھی، اور ایک چیخ مار کر کہا۔

"او بے وفا بیوی"
بیہوش ہوشیار ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ شہزاد کا سر پاؤں پر ہے
اور آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں بہ رہی ہیں اور کہہ رہی ہے،
"بے گناہ لونڈی کا قصور معاف ہو"
بے قرار ہو کر سر اٹھایا، اور دونوں میاں بیوی ششدر متحیر ایک
دوسرے کا منہ تکتے رہے،

(۸)

قصر احمدی کا ہر ذرہ جو اپنے آقا کے پاؤں پر سر رکھنے کو لوٹ رہا
تھا آج نہال نہال ہے رعیت اپنے بادشاہ کی خیر سن کر زندہ باش کے
نعرے لگا رہی ہے وزیر سردار امیر فقیر جمع ہیں اور دل سے دعائیں دے
رہے ہیں، دفعتہً ملکہ شہزاد باہر آئی اور اپنے شوہر کے قدموں پر گر کر کہا،
"بھائیو! بہنو! تم سب کو معلوم ہے کہ میں وہی شہزاد ہوں جس کی
بدمزاجی کا شہرہ تمام ملک میں تھا، اس لاپرواہی کی سزا کہ میں نے اپنے
خدائے مجازی کو خوش نہ رکھا، حقیقی خدا نے جو کچھ دی وہ ظاہر ہے
ہیں درحقیقت اس کی سزاوار تھی، گو آج بارہ سال کا عرصہ ہو گیا،
مگر میں اس وقت کو نہیں بھولی ۔ جب ظالم قزاق ادہم میری
عزت کے درپے ہوا، اور قدرت کی زبردست طاقت مجھ کو پاک
دامنی کی کسوٹی پر آزما رہی تھی، میں بے یار و مددگار تھی، میرا تخت
مجھ سے جدا ہو چکا تھا، اور کوئی اتنا نہ تھا کہ میری حمایت میں کھڑا ہو، خدا
کی عنایت میرے شامل حال تھی اور وہی ایک ایسا حامی تھا جس کی طرف
میں آدھی رات کے وقت دیکھ رہی تھی، اور کہہ رہی تھی،

کمزوروں کے مولا میری عزت بچا لے،

خدا کا ہاتھ میری مدد کو بڑھا، اور میں ظالم کے پنجے سے رہا ہوئی اور سب سے پہلے جو روح احمد پاشا پر قربان ہوئی وہ اسکی کنیز شہزاد کی تھی آج میں اس بھرے مجمع میں اپنے پچھلے قصوروں کی معافی اپنے سرتاج سے مانگتی ہوں اور تم سب کو گواہ کرتی ہوں کہ شہزاد بے گناہ ہے "

خلقت کے نعروں نے شہزاد کی پاک زندگی کی داد دی، اور سب نے ملکر کہا

"طرابلس کی ملکہ عورت نہیں فرشتہ ہے، اے آسمانی حور وطن ہمیشہ ہمیشہ تجھ پر فخر کرے گا، دنیا تیری عصمت و عفت کے گیت گائیگی، اور زمانہ کی فانی رفتار تیرے نام پر سدا بہار پھول چڑھاتی رہے گی "

احمد پاشا کی بدظنی قریب قریب دور ہو چکی تھی، مگر آئینہ دل پر زنگ کی جھلک ابھی باقی تھی ملکہ کا سر اٹھایا اور کہا۔

"انسانی شہادت بے گناہی کے واسطے کافی نہیں، جاننے والا صرف عالم الغیب ہے "

احمد کے ان الفاظ نے ملکہ کی تمام امیدیں خاک میں ملا دیں اس کا دل ٹوٹ گیا، اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا۔

"بے وارثوں کے وارث اب میری صورت احمد کو نہ دکھا میری مدد کر اس وقت بھی میرا ساتھ دے، اور میرا خاتمہ کر "

ان الفاظ کے ختم ہوتے ہی زمین شق ہو گئی دنیا دیکھتی رہی اور شہزاد زمین میں دھنس گئی،

ختم شد

بلبل کی شہادت

علم اللسان الحیوان کا مشہور ماہر و محقق علامہ ابو الطیر جب دسویں صدی عیسوی میں مملکت مصر میں پہونچا تو گو مصریوں نے نہایت فراخ دلی سے اس کا استقبال کیا مگر اس کا مقصود چونکہ صحرا و چمنستان میں محدود تھا وہ تیسرے روز علی الصباح دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ موسم سرد تھا دھوپ ناگوار نہ تھی۔ فراعنہ کی مشہور وادیوں میں مختلف الالوان و اقسام حیوانوں کو دیکھتا بھالتا اور نتیجہ اخذ کرتا پھر رہا تھا کہ آسمان پر ابر سیاہ نمودار ہوا اور آناً فاناً تمام صحرا اندھیر گھُپ ہو گیا۔ مصر کی آبادی اس مقام سے تیرہ میل اور کچھ فرسنگ تھی پناہ کی کوئی جگہ نہ ہونے سے ابو الطیر شمال مشرق کی طرف بڑھا جہاں کچھ آگ روشن تھی مگر تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ نگاہ نے مغالطہ کھایا اور یہ روشنی آگ نہیں بلکہ انسانی ڈھانچوں کے فاسفورس کی تھی تاہم وہ اس امید پر بڑھے گیا کہ کسی گاؤں میں پہنچکر رات بسر کر لوں مگر وہ کہیں بھی نہ پہنچا تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور اس غضب کا طوفان آیا کہ مسافر کے ہوش و حواس گم ہو گئے دریائے نیل لہریں لے لے کر آگے بڑھ رہا تھا بجلی کی چمک اور بادلوں کی کڑک کلیجہ دہلا دینے والی تھی اور کوئی درخت بھی ایسا نہ تھا کہ جس کے نیچے دم لے پاتا رات کے تین پہر یہ قیامت خیز مینہ اس کے سر پر رہا صبح چار

سنیچ کے قریب صبح صادق اس کی حالت پر کھل کھلا کر ہنسی اور زوردار شور کی بارش ہلکی سی بوندا باندی رہ گئی تو دامن کوہ میں اس نے ایک چٹان پر زیتون کا درخت دیکھا گو دن کی روشنی شب سیاہ پر غالب آچکی تھی مگر آسمان ابھی تک ان پردیسیوں کو جواب حرارت کی ہیئت میں اس کے مہمان تھے، کلیجہ سے لگائے کھڑا تھا اور ہوا ان دور افتادگان وطن کو گود میں لئے مختلف مقامات کی سیر کرا رہی تھی۔

ایسی حالت میں کہ ابو الطیر کو آسمان کی طرف سے بالکل اطمینان نہ تھا وہ اس چٹان پر چڑھ کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا گو سردی نے اس کو بہ اس باختہ کر رکھا تھا مگر اس کو زیادہ تر افسوس اپنی تضیع اوقات کا تھا، کیونکہ اسی ہفتہ میں اسکو طائران مصر کی مکمل رپورٹ پیش کرنی تھی اور جہاز کی روانگی کا وہی روز تھا وہ اس وقت ایک ایسے مقام پر تھا جہاں بہ ظاہر انسان وحیوان کا مطلق پتہ نہ تھا سر پر فضائے عالم پاؤں میں کنارہ دریا کی خاک سامنے پانی کی روانی اور چٹان پہلو میں زیتون کا درخت اپنے سفر کے نتیجہ ناکامی میں مستغرق تھا کہ ایک ہلکی سی آواز نے جو ابو الطیر کے سر پر نغمہ دلکش میں نکلی اور بسرعت ہوا میں پھیلی اور چٹان میں گونجی اس کو چونکا دیا یہ سریلی آواز ایک بلبل خوش الحان کی تھی جو اپنے رفیق و ہمراز مادہ کو ساتھ لئے ہوئے زیتون کی شاخوں میں چھوٹا سا گھونسلا بنائے زندگی بسر کر رہا تھا طائر خوش نوا کے الفاظ یہ تھے،

"میاں تمہم چکا سنیچ بھوکے ہیں، چلو دانہ دنکا چن لائیں۔ امرتالا کھڑا اسے ایسا نہ ہو یہ اٹھ بیٹھیں اور ہم سے ان کی پرورش کے

ی جزو میں غفلت ہو جائے۔

مادہ۔ بہت اچھا مجھے تعمیل میں کیا عذر ہے آؤ پہلے ہم اس خالق الموجودات کے گیت گائیں۔ جس نے اس چھوٹے سے گھونسلے میں ہم کو ہر طرح کا اطمینان دیا کڑکڑاتے جاڑوں میں ہم برف اور سردی سے محفوظ ہیں۔ ہزار ہزار شکر تیرا اے مولا اس قیامت خیز مینہ میں جب دنیائے حیات کا ہر ایک ذرہ متحیر کہ تنہا ہم اس گھونسلے میں خاموش اپنے لالوں کو کلیجہ سے چمٹائے اور پروں میں دبائے بجلی کی کڑک بادل کی چمک سب سے امن میں تھے "

گفتگو کے ختم ہوتے ہی نر اور مادہ دونوں نے سریلی آواز سے اس طرح کچھ نغمہ سرائی شروع کی کہ جنگل اور پہاڑ دونوں گونج اُٹھے دریائے نیل کی لہریں اس مخلوق کو جو صانع حقیقی کی قدرت کا ایک نمونہ تھی غور سے دیکھ رہی تھیں اب ہوا سرسرائی اور آسمان خاموش ہوا اور دونوں نر اور مادہ چہچہاتے ہوئے آشیانے سے باہر آئے اسوقت بظاہر ان کی آزادی میں کوئی چیز کوسوں رخنہ انداز نہ تھی مگر درخت کے نیچے ایک انسانی صورت کے نظر آتے ہی مادہ نے نفرت کی صدا بلند کی ایک چوٹی پر بیٹھ کر نظر استعجاب سے اس انسان کو دیکھا اور نر سے کہا "

" وہ قابل ملامت مخلوق جو انسان کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے اور جو یقیناً صداقت محبت سے ازلی محروم ہے جس کے وجود نے ہم سے آباد دنیا چھڑوا کر یہ جنگل بیابان بسوایا! افسوس صد افسوس آج اس خطہ میں بھی موجود ہے قریب آ پہنچا ہے وہ وقت کہ یہ مکار دو

خود غرض خاکی پتلا صرف اس لئے کہ ہماری نغمہ سنجی سے اس کو فرصت ہو دام تزویر بچھا کر ہماری سچی محبت کا خاتمہ کر دے چلو بچوں کو اٹھاؤ اور جس قدر تیز اور جلد اڑا جائے کسی ایسی سمت کا رخ کریں جہاں ایسی مکروہ صورت دوبارہ نظر نہ آئے۔

نر۔ میری محبت کی سچی قدر کرنے والی مادہ درحقیقت انسان ہمارے فطری جذبات سے قطعی ناآشنا ہے اور کس قدر مضحکہ انگیز ہے یہ بحث کہ اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی بہرحال اب ہمارا یہاں قیام نامناسب اور اندیشہ ناک ہے مگر بچے چھوٹے ہیں ننھے ننھے پروں میں طاقت پرواز نہیں مجبور ہم کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیے جب تک دونوں بچے نقل اشیا میں ہمارے شریک ہوں۔

مادہ اتنا سنتے ہی نر کی طرف جھکی اور دونوں ہوا میں اڑ گئے دفعتہ مادہ پیٹ کی دکھیا اور ممتا کی ماری نیچے جھکی اور پر تول کر زمین پر آئی قریب تھا کہ وہ اس دانہ کو جس کی زبردست کشش بے خبر طائر کو زمین پر کھینچ لائی پیٹ کے خزانے میں محفوظ کرے کہ ایک چھوٹے سے جال نے اس کی تمام امنگوں کا خاتمہ کر دیا، بہتیرا تڑپڑائی مگر رہائی کی کوئی صورت نہ تھی اور چند لمحہ بعد غریب مادہ ایک انسان کی مٹھی میں تھی جو ایک ہفتہ بعد قفس طلائی میں مقید کر دربار شاہی میں پیش کر دی گئی۔

(۳)

"میں بے گناہ ہوں اس لئے کہ میں نے اپنی عزت ایک ظالم

مکار سے محفوظ رکھی صرف اس لئے کہ اپنا دامن عصمت بجائے
اس کے کہ ایک دغا باز کی جھوٹی محبت سے آلودہ کرتی اپنے لال کے
خون سے رنگا قتل کی جاتی ہوں۔ دنیا والو! تمہاری دنیا تم کو مبارک
یہ درحقیقت ہمارے رہنے کا گھر نہ تھا، مگر یاد رکھو۔ دور نہیں ہے
وہ وقت جب ایک زبردست ہاتھ ہمارا تمہارا فیصلہ کریگا، انسانی
صورت میں چھپے ہوئے شیطانو! ہم نے محض تمہاری وجہ سے
اپنی آزادی کھوئی قید ہوئے پردہ میں بیٹھے مگر تم کو صبر نہ آیا، پتھر سے
زیادہ سخت دل رکھنے والی صورتو! تمہارے ہاتھ سے اپنی عفت
بچانے میں ہم کو بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑیں، لیکن اسے لٹیرو۔ قزاقو!
بازار حسن میں دن دہاڑے عفت وعصمت کے خزانوں پر ڈاکہ ڈالنے
والو! تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے، بھولی بھالی بچیوں کو جال میں
پھنسایا، سیدھی سادھی بیٹیوں کو دھوکے دئے اور غریب مسکین
بیویوں کو جھوٹی امیدیں دلا کر برباد کر دیا۔ میں بھی تمہارے ایک ادنیٰ
کرشمہ کا شکار ہوں مگر بہت خوش ہوں کہ میری پاک دامنی آب و
تاب سے چمک رہی ہے اور عصمت وعفت کے پھول میرے
ہر رونگٹے میں کھل رہے ہیں۔ چل بھائی جلاّد چل اور اپنا کام کر۔"
دربار اسمٰعیلی گرم تھا امرا رو رؤسا خاموش بیٹھے تھے اور ایک
حسین لڑکی باوازِ بلند یہ الفاظ ادا کر رہی تھی۔ مفتی اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور کہا۔
"شہنشاہ اسمٰعیل کے عہد سلطنت میں اے عورت، تو ایک
معصوم بچہ کے قتل کی مرتکب ہوئی اور شہزادہ سلیم کی شہادت سے
جرم تجھ پر ثابت ہو گیا اس لئے میں قصاص کا فتویٰ دیکر تیری گردن تن

سے جدا کرواتا ہوں۔

شہنشاہ اسمٰعیل کے دوران حکومت میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ مجرم سزا کو ظلم سمجھے اور بے گناہ ہونے کا مدعی ہو، مگر منجھلے لڑکے شہزادہ سلیم جیسے ثقہ مسلمان کی شہادت ایسی نہ تھی کہ اسمٰعیل یقین میں متامل ہوتا۔ تاہم وہ عورت کی یہ تقریر سن کر متحیر تھا، کبھی قاضی کو دیکھتا تھا۔ کبھی مفتی کو تاکتا اور کبھی طائر خوش الحان پر نگاہ ڈالتا۔ مجرم جلاد مقتل میں پہونچے۔ تیغ آبدار میان سے باہر آئی۔ اور آناً فاناً تن بیجان زمین پر تڑپنے لگا۔

(۳)

آج ان باتوں کو دو برس سے زیادہ گذر گئے مرنیوالی عورت کی ہڈیاں خاک ہوگئیں، شہنشاہ اسمٰعیل متفکر و مغموم بیٹھا ہے امرار و رؤسا حاضر ہیں دفعتہً بادشاہ نے ابو الطیر سے خطاب کیا یہ مدنع پرند جس میں مٹھی بھر پروں کے سوا کچھ نہیں جو انسان کو حقارت و نفرت سے یقیناً خدا کی قدرت کا نمونہ ہے ایک وقت واحد میں ہزاروں پرندوں کا مجموعہ میری پیش نظر رہا۔ اور اگر وہ تمام تعداد شمار کی جائے جو آج تک میرے مطالعہ میں رہی تو غالباً لاکھوں تک پہونچے گی۔ لیکن میں نے ایسا مغرور اور قابل پرند دیکھا نہ سنا اس کی فراست۔ حافظہ اور دماغی قابلیت یقیناً انسان سے متجاوز ہے۔ ابو الطیر دن کی بھوک اور رات کی نیند سب اڑ گئی۔ اس بچہ کا انصاف کرنے میں اب صرف ایک ہفتہ باقی ہے۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ اس کی ماں بے گناہ قتل ہوئی ادھر دیکھتا ہوں تو قتل کی سب سے

ہی وجہ اس سلیم کی شہادت ہے جو قیامت تک جھوٹ نہ بولیگا
ابوالنظیر۔ والاقدر۔ ہم سب اس معاملہ میں متحیّر ہیں۔ ادہر لڑکا کہتا ہے۔ بادشاہ میری فریاد سن۔ اور داد دے میری ماں بے گناہ قتل ہوئی اُدہر صاحب عالم جیسا جوان صالح۔ جس کی نظیر مشکل ہے۔ جرم کا شاہد الغیب عند اللہ۔
بادشاہ۔ خدارا تم سب میری مدد کرو۔ ایسا نہ ہو سلیم کے مقابلہ میں ہم انصاف سے محروم رہیں۔ مرنا برحق اور یوم الحساب یقینی۔ دعا کرو کہ مقدمہ کا نتیجہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو۔ لیکن لِلّٰہ مجھے صلاح دو کیا کروں ؟
پرسوں فیصلہ کی تاریخ ہے۔ اللہ ہم پر رحم کرے

(۴)

رات اپنی تیسری منزل پار کر چکی تھی اور آسمان قریب ہے۔ کہ اس روز کے آفتاب سے بغل گیر ہو جس کے انتظار میں خلق اسد گھڑیاں گن رہی تھی۔ اور یہ وہ دن تھا کہ وہ دس برس کی معصوم روح جو اپنی بے گناہ ماں کے قتل کی مدعی تھی دربار اسلامی سے اپنی داد لے بادشاہ رات کے اس سنسان وقت میں کہ تمام دنیا نیند کے مزے لے رہی تھی۔ متحیر و پریشان بیٹھا تھا،

ابوالنظیر جو ہر وقت کا ہمدم و ہمراز تھا سرنگوں اور خاموش بیٹھے بیٹھے اُکتا کر اس طرح عرض کرنے لگا ؛

" والا منزلت پریشانی اور تفکرات کی حد ہو چکی۔ کوئی وجہ

نہیں کہ ہم صاحب عالم کی شہادت کو نا قابل اعتبار تسلیم کریں یقیناً یہ لڑکا جھوٹا اور کسی مفسد گروہ کا سکھایا پڑھایا ہے۔ دعویٰ خارج کیجئے اور اس بچہ کو ایسی سزا دیجئے کہ آئندہ کسی کو اس قسم کی غلط بیانی کی جرأت نہ ہو۔

بادشاہ۔ تین مہینے کے متواتر غور و فکر کے بعد جس نے میری صحت بگاڑ دی۔ میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ منفی بچہ جو فساد کی پوٹ ہے۔ سخت سزا کا مستحق ہے۔

بادشاہ کا یہ فقرہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ بلبل خوش الحان کھلکھلا کر ہنسی اور کہا۔

"او دغا باز انسان ابو الطیر ایسی جھوٹی خوشامد نہ کر کہ ایک ایسا یتیم معصوم جس کے ساتھ کوئی وارث نہیں انصاف سے محروم رہے تو او مکار ابو الطیر تو صرف اس لئے کہ سلیم شاہزادہ ہے بادشاہ کو انصاف نہ کرنے دے۔ اگر تو اور تیرا بادشاہ دونوں وعدہ کریں کہ مجھے آزادی نصیب ہو جائے گی، تو میں غفلت کا پردہ تم دونوں کی آنکھوں سے اٹھا دوں اور بتا دوں کہ لاوارث یتیم اپنے دعوے میں کہاں تک سچا ہے اور شاہزادے کا بیان کیا ہے"

بلبل کی اس گفتار سے ابو الطیر اور بادشاہ دونوں سناٹے میں آ گئے اسمٰعیل اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا" طائر خوش بیان میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو اس راز کا انکشاف کرے تو تجھ کو ہمیشہ کے واسطے آزاد کر دوں گا۔"

بلبل - بادشاہ بہتر ہوگا کہ ابوالطیر بھی ہمارے اس قول میں شریک ہو۔

ابوالطیر - مرحبا طائر خوش نوا للہ ہماری حالت پر رحم کر اور اس راز کو کھول جس نے ہماری بھوک پیاس سب کا خاتمہ کر دیا ۔

بلبل - سن اے سنگ دل انسان سن - اگر غیرت و حیا کا مادہ موجود ہے تو کوشش کر کہ پردہ دنیا پر انسان کا وجود باقی نہ رہے واقعہ یہ ہے کہ گرمی کے موسم میں جبکہ بساط زمین پر چاندنی نکھری ہوئی تھی - شاہزادہ سلیم نے اس عصمت مآب عورت کو جو ایک معمولی چیری تھی - آدھی رات کے وقت جگایا غور کرو مردو غور کرو - اور خیال کرو کیا کہہ رہا ہوگا دل اُس بدنصیب غریب اور بے کس عورت کا جس کے سر پر کوئی حامی موجود نہ تھا اور ایک سلطنت کا ولی عہد جس کے سر پر سلطنت کا بھوت سوار تھا اسکے سر پر کھڑا ہے دور ہو جاؤ میرے سامنے سے انسانیت کا دعویٰ کرنے والے مردو میری آنکھوں کے سامنے ہے وہ وقت جب ایک حسن کی دیوی اور عصمت کی ملکہ لرزتی اور کانپتی ولی عہد کے قدموں میں گری پڑی ہے - آہ اے ابوالطیر رات اس کی گریہ وزاری میں صبح ہو گئی - مگر ظالم سلیم کا دل نہ پسیجا یہاں تک کہ روز روشن نے مظلوم کی حالت پر رحم کیا اور ظالم کے قبضہ سے نکلوا دیا۔

نظام عالم بدستور اپنا کام کر رہا تھا جب آفتاب غروب ہوا تو جھٹ پٹے وقت یہ بدنصیب عورت کلثوم جس کی عدت بھی پوری نہ ہوئی تھی اپنے آٹھ برس کے بچہ کا ہاتھ پکڑ اور چھوٹے بچہ کو گود میں لئے ایک سپید چادر اوڑھ باہر نکلی مگر تقدیر ساتھ نہ تھی دروازہ محل پر سلیم سے مٹ بھیڑ ہوئی اور وہ شقی القلب بجبر واپس لے آیا۔

ایک بدنصیب لونڈی دکھیاری بیوہ کی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ زبان سے شکایت نکال سکتی اپنے بچھٹے ہوئے بچھونوں پر لیٹ کر خدا کے حضور میں عرض کرنے لگی۔

احکم الحاکمین لاوارث بیوہ کی عصمت تیرے سپرد ہے معبود حقیقی میری حفاظت کر اور سنگ دل کے پنجہ سے بچا۔"

اسمٰعیل! انصاف کی آنکھیں کھول اور دیکھ وہی آدھی رات کا وقت ہے اور سلیم جب کسی طرح کامیاب نہ ہو سکا تو دودھ پیتے بچہ کو گود سے چھین خنجر آبدار نکالا اور کہا کہ اگر اب بھی تو اپنی ہٹ پر قائم ہے تو یہ بچہ قتل ہوتا ہے اور اس کے قتل میں تو گردن زدنی ہے"

کلثوم۔ اگر اس بچہ کی قربانی اور میرا قتل میری عصمت کو بچا لے تو اس سے زیادہ مجھے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔

سنگ دل بچہ کے باپ بادشاہ اسمٰعیل کے خنجر نے دفعتہً اس ننھی سی جان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا اور ماں متاوالی جس کے سینہ سے دودھ اُبل رہا تھا اپنے پھول کی گردن تڑپتی ہوئی دیکھ رہی تھی سلیم کا خونی لباس املی کے درخت کے نیچے دفن ہے

اور وہ بتا دے گا کہ بچہ کا قاتل کون تھا کلثوم کے برخلاف یہ بیان کہ وہ بدچلن تھی اور بچہ ماں کے ہاتھوں قتل کیا گیا صریح بہتان ہے۔
سچ بتا ابو الطیر! کیا یہ ہی ہیں وہ افعال جو انسان کو حیوان سے ممیز کریں۔ اور کیا یہ ہی ما بہ الامتیاز ہے مجھ پر رحم کر کھڑکی کھول دے اور میری اس دعا میں شریک ہو کہ اب بقیہ عمر انسان کی صورت نہ دیکھوں "

بادشاہ اور ابو الطیر دونوں ششدر تھے درخت کھودا گیا اور سلیم کا لباس خون میں رنگا نکلا۔

شہسوار مشرق آسمان پر طلوع ہو چکا تھا اراکین دربار حاضر ہونے شروع ہوئے بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ولیعہد دائیں طرف کرسی زرنگار پر تھا کہ معصوم بچہ آکر زمین بوس ہوا۔ اور بہ آواز بلند کہا۔

"بادشاہ میرا انصاف کر۔ میری ماں بے گناہ قتل ہوئی! میری داد دے یا مجھے بھی میری ماں سے ملا دے"

" اس وقت اسمٰعیل کی گردن نیچی تھی وہ خاموش تھا چند لمحہ بعد اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر کہا ازلی و ابدی راج والے مجھے توفیق دے کہ انصاف کے میدان میں ڈگمگا نہ جاؤں "

اتنا کہہ کر اسمٰعیل نے وزیر کی طرف دیکھا اور حکم دیا کہ جلاد کو حاضر کرو۔

تمام دربار ساکت تھا اور کسی کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ اس

وقت کیا ہوگا۔ بظاہر بچہ کی موت یقینی تھی۔ اور اس کے بچپن پر ہر شخص افسوس کر رہا تھا۔

دفعتہً اسمٰعیل اٹھا اور اس کے ساتھ ہی تمام دست بستہ دربار کھڑا ہوا۔ اسمٰعیل نے سلیم کی طرف منہ کیا بلبل کا پنجرہ ہاتھ میں لیا اور کہا۔

"او نابکار تو اسی واسطے ولیعہد بنایا گیا تھا کہ خدا کے بندوں پر علانیہ ظلم کرے اور اپنی جھوٹی غرض کے واسطے ایک پاک لڑکی پر ایسی لڑکی پر جو تمام سلطنت کے واسطے مایۂ ناز تھی۔ الزام لگائے اس کے معصوم بچہ کو قتل کرے اور شہادت دے کہ مقتول کی قاتل یہی ہے۔

یہ مظلومی پھر پر جو ایک بلبل کی صورت میں تیرے سامنے ہے۔ تیری تمام حقیقت بیان کر چکے۔ اس لباس کو دیکھ جو تیرے قتل کی شہادت دے رہا ہے۔

واقعات چونکہ اچھی طرح ثابت کر چکے کہ تیری شہادت جھوٹی تھی جس کی وجہ سے ایک بے گناہ قتل ہوئی میں حکم دیتا ہوں کہ میرے روبرو جلاد تیری گردن تن سے جدا کرے۔"

اس حکم نے محل میں کہرام مچا دیا تمام درباری ساکت رہ گئے ہر شخص سلیم کی حالت پر رو رہا تھا۔ لوگ بچے کے قدموں میں گرے کہ وہ اپنے دعوے سے باز آئے، مگر وہ اس کے سوا کچھ جواب نہ دیتا تھا کہ انصاف کرو یا مجھ کو میری ماں سے ملا دو۔ محلوں کی بیٹھنے والیاں بچہ کی منت خوشامد کر رہی تھیں

وہ کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا، یہاں تک ایک برقع پوش عورت مجمع میں آئی اُس نے اپنے منہ پر سے نقاب اُٹھا کر اس بچہ کو دیکھا اور بآواز بلند کہا،

"دعوے سے باز آ اور اپنی ماں سے مل"

اتنا سُنتے ہی بچہ بیتاب ہو کر دوڑا اور ماں ماں کہتا ہوا اس عورت سے لپٹ گیا۔ حاضرین پر سکتہ کی حالت طاری تھی اور کسی کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ ماجرا کیا ہے۔

وزیر سلطنت اس موقع پر اُٹھا اور عرض کیا۔

"جہاں پناہ! مجھے اس عورت کے بیگناہ ہونے کا یقین تھا، اتفاق سے ایک خونی عورت ان دنوں جیل خانہ میں موجود تھی جو قتل کی گئی، اور لڑکی کی حیثیت سے آجتک میرے پاس محفوظ رہی بچہ کا خون یہ معاف کرتی ہے۔ اسلئے جہاں پناہ بھی شہزادہ کو رہائی دیں"

اب بلبل ہزار داستان پھڑ پھڑائی۔ اور کہا کہ "شہنشاہ وعدہ پورا کر۔ سر اُٹھا اور درخت پر دیکھ اس گھونسلے میں میرا نر آجتک اپنی تنہا زندگی بسر کر رہا ہو اور صرف اسلئے کہ ہم دونوں تھوڑی دیر کو آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں تمام تکلیفیں ہیچ ہیں بادشاہ دیکھ اور انصاف کر کہ انسان کس طرح اپنی زندگی گذار رہا ہے اور ہم جانور کیونکر جیتے ہیں۔ بادشاہ ہم سے سبق لے اور یاد رکھ کہ انسان جس کی زندگی کا مقصد خود غرضی کے سوا اور کچھ نہیں انسانیت میں جانور سے بہت گرا ہوا ہے"

کھڑکی کھلی ہوئی تھی بلبل یہ کہہ کر باہر آئی درخت پر بیٹھی اور دونو نر مادہ خدا حافظ کہہ کر اپنے وطن رخصت ہوئے۔　　سنہ ۱۴ء

بے گناہ کا قتل

بغداد سے چوبیس یا پچیس کوس دور کنارِ فرات پر ایک باغ سلسبیل
کوثر کے نام سے مشہور ہے جو ہارون رشید کی مشہور بیگم زبیدہ کا بنایا ہوا ہے
باغ کے برابر سرسبز و شاداب کھیتوں کی قطار دور تک پھیلی ہوئی ہے ان
کسانوں کی جو یہاں کام کرتے ہیں جھونپڑیاں دریا کے کنارے دور تک چلی
گئی ہیں لہلہاتا سبزہ ہرے بھرے کھجوروں کے جھنڈوں کھیتوں اور خودرو
پھولوں کی رونق دوبالا کر رہے چاندنی رات میں دو جوان لڑکیاں ایک
کھیت کی ڈول پر بیٹھی اس طرح باتیں کر رہی تھیں۔

اب وہ وقت قریب آگیا کہ ہم میکے سے رخصت ہو کر سسرال
پہونچیں ماں باپ ہم سے چھوٹ جائیں گے بہن بھائی ہم سے جدا ہوں
گے اور یہ تمام زندگی آگے چل کر ایک کہانی معلوم ہو گی۔

مغیرہ۔ ماں باپ کی مفارقت ایسی چیز نہیں ہے جس پر تم آنسو
بہاؤ ساری دنیا اسی دستور سے چل رہی ہے اور چلے گی۔ ہم گھر کے
مالک ایک شخص کے حاکم اور اپنی مرضی کے مختار ہوں گے۔ گو میرے
والدین کی مالی حالت تم سے بہت بہتر ہے اور وہ مجھ سے محبت
بھی کرتے ہیں مگر میں تو ہر وقت کی قید اور ان کے غصہ سے اکتا
گئی اور خدا سے چاہتی ہوں کہ کہیں جلد یہ زمانہ ختم ہو اور میں ان سے
علیحدہ ہوں۔

عزرہ ۔ تم میری مہمان ہو بڑی آدمی ہو میں کیا کہوں مگر افسوس کہ یہ آزادی کا زمانہ تم کو کٹھن ہو گیا اور ماں باپ وبال جب تم ایسے محسنوں سے بیزار ہو تو یہ خود غرضی تم کو دنیا میں زیادہ خوش نہ رکھے گی ۔

مغیرہ ۔ تمہاری عقل اور حالت دونوں پر افسوس ماں باپ عارضی تنکے ہیں اصل دنیا شوہر ہی سے ہے میں ایک امیر آدمی کی لڑکی ہوں میری سینکڑوں درخواستیں آرہی ہیں ظاہر ہے تم سے پہلے بیاہی جاؤں گی مگر میں نہایت خوشی سے اس وقت کی منتظر ہوں جب کو اس کنبہ کے جھگڑوں سے چھوٹوں ۔ میں بغداد جاتی چند گھنٹوں کے لئے گو ظاہر میں تم سے ملنے ٹھیری ہوں مگر درحقیقت میری غرض امیر کو دیکھنا ہے جو شادی کے سخت تقاضے کر رہا ہے اور میرے والدین بھی راضی ہو گئے ہیں ۔

آج اس کا لشکر بھی یہیں مقیم ہے ؛

عزرہ ۔ خدا تم کو اس مقصد میں کامیاب کرے اور تم اس سر زمین کی بیگم ہو مگر میری پیاری سہیلی مغیرہ میکے سے اتنی نفرت نہ کرو ان دنوں کو یاد کرو گی اور پچھتاؤ گی ۔

مغیرہ ۔ تم کسان کی لڑکی ہو تمہاری عقل چند کھیتوں میں محدود ہے اس ذکر کو جانے دو کچھ اور باتیں کرو ۔

امیر احمد آفندی والی غرناطہ زیتون کے درخت کی آڑ میں کھڑا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا ان کی گفتگو ختم ہوتے ہی وہ الٹے پاؤں اپنے خیمہ میں آیا اور عزرہ کے پیش بہا خیالات پر غور کرنے لگا ۔

(۲)

صبح صادق کا سہانا وقت ہے زمیندار اور کسان اپنے امیر کی خدمت میں نذریں پیش کر رہے ہیں اور ہشاش بشاش واپس آ رہے ہیں تمام نذریں گذر چکیں تو ایک غریب لڑکی حاضر ہوئی اس کے پاس صرف چند پھول نذر کے واسطے موجود تھے وہ زمین بوس ہوئی جھک کر سلام کیا اور عرض کرنے لگی:

"میرا باپ اندھا اور ماں بیمار ہے کوئی بھائی میرا نہیں جو اس فرض کو ادا کرے اپنے الطاف خسروانہ سے یہ حقیر نذر قبول فرمایئے اور رعیت کی ایک ادنیٰ کنیز کی عزت افزائی کیجئے"

امیر۔ تمہارا نام کیا ہے؟
عزّہ۔ مجھے عزہ کہتے ہیں۔

امیر نے گلدستہ کو ہاتھ لگا دیا وزراء نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا اور عزّہ اپنی جھونپڑی میں لوٹ گئی۔

(۳)

امیر رات کی گفتگو سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ اس کا دل تمام رات عزہ کے خیالات پر تحسین کرتا رہا اس وقت کی گفتگو نے امیر کو اور بھی گرویدہ کر دیا اور اُس نے فوراً جا کر عزہ کے باپ سے شادی کی درخواست کی۔

امیر شہر کی التجا ایک غریب کسان کو عید ہو گئی اور عزہ ملکہ غرناطہ بن کر محل شاہی میں داخل ہوئی رسم عروسیہ جس کی نقل ہمارے ہاں آرسی مصحف سے ادا ہوئی اور امیر نے اسوقت

ایک بیش بہا انگوٹھی دلہن کو چڑھائی اور کہا کہ "یہ وہ انگوٹھی ہے جو میرے باپ امیر محمد بن منذر نے میری ماں کو قرونیہ میں دی اور جو میری ماں نے بستر مرگ پر میرے باپ کی اجازت سے مجھ کو عطا کی یہ میری امانت ہے جو تم اس وقت تک محفوظ رکھو جب تک موت ہم دونوں کو جدا کرے"

(۴)

قصر احمدی کی در و دیوار پر راحت و انبساط کی جھڑیاں لگ رہی ہیں بادشاہ ایک جواہر نگار کرسی پر جلوہ افروز ہے اور برابر میں ایک زمردیں مسہری پر عزہ جواہرات میں ڈوبی زرق برق پوشاک میں جگمگا رہی ہے امیر کی باچھیں خوشی کے مارے کھلی جا رہی ہیں اور اس کی ٹکٹکی اپنی اقبالمند بیگم کے چہرہ پر بندھی ہوئی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد امیر مسکرایا اور کہا۔

"ملکہ میں خوش نصیب ہوں کہ مجکو خدا نے تم جیسی بیوی دی ہیں اور میری رعیت دونوں مبارکباد کے قابل ہیں کہ ہم کو ایسی بیگم میسر آئی!"

عزہ۔ یہ صرف حضور کی قدر افزائی ہے ورنہ میں ایک ادنیٰ کنیز اس قابل کہاں تھی کہ اس مرتبہ کو پہنچتی۔

امیر۔ بیگم! میری درخواست رد نہ کرو اور خدا کا واسطہ اپنے والدین کو بلالو۔ سرزمین غرناطہ کا چپہ چپہ اور قصر احمدی کا ذرہ ذرہ اُن کا استقبال کریگا۔ لِلّٰہ مجھے اجازت دو کہ میں ان دونوں محترم والدین کو خود جا کر لے آؤں۔

عزرہ ۔ میں امیر کی اس عنایت کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی مگر بادشاہ وہ اپنی وضع کے پابند لوگ ہیں اس ارشاد کی تعمیل نہ کر سکیں گے وہ حضور کی رعیت ہیں اور وہ ہیں بیٹھے بیٹھے آپ کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں ۔

امیر ۔ میری عزیز بیگم! وہ میری رعیت نہیں اب میں تمہاری اور تمہارے والدین کی رعیت ہوں ملک تمہارا حکومت تمہاری سلطنت تمہاری ۔

عزرہ ۔ بادشاہ خدا اقبال میں ترقی دے اس معاملہ میں اصرار نہ فرمایئے ہاں میری سہیلی مغیرہ کے متعلق جو کچھ آپ نے کل فرمایا تھا وہ درست نہیں ہے اس کا باپ مر چکا وہ رحم کی مستحق ہے اس کی جائداد جو عاقل نے ضبط کی ہے چھوڑ دینی چاہئے ۔

(۵)

دوپہر کا سنسان وقت ہے اور تمام امرا و وزرا خاموش کھڑے ہیں پائیں باغ کی بارہ دری میں امیر غصہ میں بیتاب برہنہ خنجر ہاتھ میں لئے ٹہل رہا ہے ۔ ایک برقع پوش عورت سامنے کھڑی ہے اور بالکل سناٹا ہے ۔

امیر نے کچھ سوچا اس کی آنکھیں غصہ سے لال ہو گئیں اور کڑک کر کہا،

"دوہرا پھر دوہرا تو نے کیا کہا"

عورت ۔ جو کچھ کہا ہے ثابت کروں گی میرا چچا زاد بھائی حارث دغاباز ملکہ کو آپ سے زیادہ عزیز ہے اور زندہ ہے ۔

امیر ۔ اچھا ۔ جا، تین روز کے اندر ثابت کر کہ تو سچی ہے مگر یاد رکھ

کہ تیری قضا سر پر سوار ہے

عورت ۔ اگر ثابت کر دیا ؟

امیر ۔ آہ ! پیاری عزہ تیری آنکھوں کے سامنے سنگسار ہو گی ۔

(۶)

"بیگم ! میں آپکی قدیم نمکخوار میری سات نسلیں آپ کے بزرگوں کا نمک کھائیں ۔ میں آپ سے غلط کہوں گی تو نمک حرام رعیت بن کر کس طرح زندہ رہ سکتی ہوں ۔ میری ماں آپ کی ساس کی عمر بھر شیر رہیں اُن کی وصیت تھی کہ ہر سال نوروز کی رات کو آدھی رات کے وقت اس انگوٹھی کو سات دفعہ دودھ سے دھو کر جانماز پر رکھ کر خدا سے بادشاہ کی درازی عمر کی دعا کی جائے ۔

عزہ ۔ میں ایسا خیال آپ کی طرف سے نہیں کر سکتی ۔ گو آپ کو میں نے صرف ایک دفعہ پہلی رات کے وقت دیکھا اگر آپ میری خیرخواہ ہیں میں نے یہ انگوٹھی کبھی نہیں اُتاری آپ کو جو کچھ دعا کرنی ہے میرے سامنے کیجئے ۔

خیرخواہ ۔ لائیے انگوٹھی دیجئے ابھی آپ کے سامنے ۔

انگوٹھی دودھ سے دھوئی گئی دعا کر چکی اور عزہ نے بدستور انگوٹھی پہن لی

(۷)

"حضور ! یہ انگوٹھی میرے بھائی نے صرف اس شرط پر دی ہے کہ اُسکی جان بخشی کی جائے ۔ حضور ! ابھی خاموش رہیں اور اگر میرے دم میں دم ہے تو میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سرکار کو اپنی آنکھ سے دکھا دوں گی ۔

امیر غصہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا اس کی آنکھوں سے خون ٹپک

رہا تھا اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ تمام غرناطہ کو آناً فاناً تاخت و تاراج کردے۔ رعب شاہی سے دفعتہً غصہ میں بے حواس ہو کر کہا۔ میری عزت کی خیر خواہ لڑکی قریب آ گیا ہے وہ وقت کہ نا ہنجار اور بے وفا عزہ جس نے اپنے سب سے بڑے جوہر کی قدر نہ کی تیرے سامنے سنگسار کر دی جائے اور تو ایک ملکہ ہونے کی حیثیت سے محل میں داخل ہو۔

(۸)

آفتاب غروب ہونیکی تیاریاں کر رہا ہے چڑیاں روز روشن کو وداع کر رہی ہیں اور ملکہ غرناطہ کچھ خاموش گم سم اس خیال میں بیٹھی ہے کہ آج تین روز سے احمد نے قدم نہیں رکھا میں کئی دفعہ عرض کر چکی ہوں مگر میری درخواست قبول نہیں ہوئی احمد جو میری صورت کا دیوانہ تھا تین شبانہ روز مجھ سے خود علیحدہ نہیں رہا۔ بلکہ میری اس تین روز کی زندگی کو برباد کر کیا اس کو نہیں معلوم کہ مسلمان اور فرماں بردار بیوی کو اپنے شوہر کی کسقدر محبت ہوتی ہے۔

عزہ انہیں خیالات میں پریشان تھی کہ ایک خیر خواہ کے حاضر ہونیکی اطلاع ہوئی۔ باریابی کی اجازت ملی اور عورت نے قدم بوس ہو کر عرض کیا۔

"میں یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ آپ کے بزرگ باپ نے آپ کی صورت دیکھنے کے واسطے سفر کی مشقت گوارا کی مگر تقدیر نے بدنصیب باپ کو اس نعمت سے محروم رکھا اور راستہ کی مسافت سفر کی تکان نے جان بر نہ ہونے دیا۔ کھجور کے درخت کے نیچے اس پردیسی مسافر نے زندگی کو الوداع کہا اور آپ کی محلوں کی

دیوار کے نیچے وہ بدنصیب باپ آپ کی صورت کو ترستا اور پھڑکتا رخصت ہو گیا!!

عزہ اتنا سنتے ہی ایک چیخ مار کر محل سے باہر آئی اور اس صورت کی راہ بری سے اس مقام تک پہنچی جہاں ایک شخص اندھیر گھپ میں درخت کے نیچے منہ سر لپیٹے پڑا تھا۔ بے تاب ہو کر اس کے قدموں پر گری اور دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔

احمد والیئے غرناطہ یہ سماں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا تھا رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی حکم دیا کہ عزہ کو گرفتار کرو اور علی الصباح گردن اُڑا دو۔

(۹)

غرناطہ کا ہر متنفس مقتل میں جمع ہے اور رعیت کا ہر فرد بشر اپنی ملکہ کے قتل پر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ جلاد برہنہ تلوار لئے سامنے آیا اور حکم شاہی سنا کر کہا۔

"بے وفا اور نمک حرام ملکہ موت کے واسطے تیار ہو!"

عزہ کے دونوں معصوم بچے مقتل میں موجود تھے اور بے گناہ ملکہ قتل کے واسطے تیار تھی بچے اپنی ماں کے کلیجہ سے لپٹے اور چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ عزہ نے اس وقت ان دونوں معصوموں کو گلے سے لگایا اور کہا۔

میں "جوہر عصمت" سے محروم ہونے کے الزام میں قتل کی جاتی ہوں مگر والیئے غرناطہ کا فیصلہ غلط ہے۔ سچا فیصلہ احکم الحاکمین کا ہو گا۔ جو عنقریب ہونیوالا ہے۔

معصوم روحوں تم دنیا میں خوش رہو اور یقین کرو کہ تم جس ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہو وہ ایک شریف کسان کی بچی تھی قیامت کے روز تم سے شرمندہ نہ ہوگی وہ بے گناہ ہے اور وہ ماں جس کے دودھ سے تم نے پرورش پائی ان تمام الزاموں سے پاک ہے جو اُس پر رکھے گئے۔ بس پیارے بچو! مجھ سے رخصت ہو اور ان الفاظ کو جو ایک بے گناہ ماں کی زبان سے نکلے ہیں یاد رکھنا کہ کسان زادی کے دودھ میں فرق نہ آنے پائے۔ باپ کی اطاعت میں کسر نہ کرنا۔"

"عصمت" ستمبر ۱۹۱۲ء

بھاوج کا کینہ

"بھائی جان! میں بے وارثی ہوں میرا والی میرے سر سے اٹھ گیا۔ میں آپ کے ٹکڑوں پر پڑی ہوں محتاج ہوں۔ دست نگر ہوں، میرا منہ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں بھلا خیال فرمائیے سکندر کی اتنی مجال ہے کہ وہ میاں فہیم کے پتھر مار سکے آپ شاید میری بات کا اعتبار نہ کریں مگر میں خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر ایمان سے کہتی ہوں کہ جب آپ نے اجازت دیدی ہے اس کے بعد میں نے سکندر کو آدھی روٹی دیدی۔ جب میاں فہیم نے کہا کہ پہلے میری ٹکیہ ڈال دو تو میں نے فوراً ہی پیڑا بنالیا۔ وہ روتے ہوئے ادھر چلے آئے۔ آپ جو کچھ فرمائیں درست ہو"

(ا)

قمری مہینے کی چودھویں تاریخ ہے جمنا شاہ جہاں کی پیاری بیگم کی ہڈیاں گود میں لئے ہوئے لہریں لے رہی ہے تاج محل سے مشرق کی طرف تقریباً سو گز کے فاصلہ پر گیتی آرا منزل ہیں جو ایک انگریزی وضع کی کوٹھی ہے گیتی آرا بیگم اپنی مسہری پر بیٹھی ہوئی ہے۔ موسم گرم ہے اور نیم کے درخت میں سے چاند کی روشنی، چھن چھن کر اس کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے مسٹر ظفر آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ہر چند خوشامد کر ریں

ہیں مگر بیوی کا مزاج کسی طرح خاطر میں نہیں آتا بالآخر مسٹر مظفر نے کہا۔

"بیگم! میں ہرگز قمر کی تمہارے مقابلہ میں پرواہ نہیں کرسکتا۔ اگر سکندر نے نمک حرامی کی اور ہمارے کلیجہ کے ٹکڑے پر ہاتھ اُٹھایا تو تم ابھی اسکو اس نیم سے باندھ کر اپنے ہاتھ سے ادھ موا کردو میں پہلے ہی ان کے گھر میں آنے کا روادار نہ تھا تم نے مجھے مجبور کیا اور آج میرے دل کو محض تمہاری وجہ سے تکلیف پہنچی۔

بیگم - میں تو خدا سے ڈرتی ہوں یہی خیال کیا تھا کہ آخر یہ رانڈ بہن ہے جو اللہ دے گا ہاتھ جوڑوں کی پیش کروں گی۔ خدا دیکھ رہا ہے۔ جب تک ان دونوں کو کھانا نہیں کھلا دیتی اپنے منہ میں ٹکڑا نہیں ڈالتی سکندر بھی تو آخر بچہ ہی ہے کیا کیا جائے تقدیر کی چوٹ تھی قصور فہیم ہی کا ہے نہ پھوپی جان سے درخواست کرتا کہ ماما سے تکیہ کھلوا دو نہ پٹتا۔ میں نے تو بہتیرا منع کردیا تھا کہ تمہارے کانوں تک یہ خبر نہ پہونچے اس بیوقوف مغلانی نے تم سے ناحق کہدیا۔ خیر جو ہونا تھا ہوگیا اب جانے بھی دو"

(۳)

گرمی ختم ہوئی۔ کڑکڑاتے جاڑے ہیں اور ہماوٹ برس رہی ہے چکراکٹہ پہاڑ کے صدر بازار میں علی الصباح ایک شورت سررشتہ دار کا مکان ڈھونڈتے پہونچی ایک معمولی سا کپڑا جس میں روئی تھی نہ سموراسکی ردا تھی اور ایک معمولی سا لال

کپکپاتا ہوا اس کے ساتھ سردی دونوں ماں بیٹوں پر اپنا اثر کر چکی تھی بچے کے ہاتھ پاؤں شل تھے وہ اب چلنے کے قابل نہ تھا مگر بدنصیب ماں اس کو گود میں لئے تھی اور قریب آرہا تھا وہ وقت کہ خود اس کے ہاتھ پاؤں بھی جواب دیدیں وہ گھر پر پہنچ کر ٹھٹکی ہمت کر کے آگے بڑھی ڈیوڑھی سے نکل بھی مگر جرأت کی اور آگے چلی دفعتہً ایک مرد نے چلا کر کہا۔کون ہے کہاں سے آئی ہے کیا کہتی ہے وہیں رہ ؎

فقیرنی۔ بوا میں نے تو اسی لئے رشتہ داری بنایا کہ میری حالت اس قابل نہ تھی خدا تجھ کو خوش رکھے۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ جب محنت ہی کر کے پیٹ پالنا ٹھیرا تو بھائی کی کی بہن کی کی تجھے اس میں بھی عار ہے تو اچھا بوا خدا حافظ ہے۔ یہ روپے تیرے کام آئیں گے میرا خدا مجھ کو دینے والا ہے یہ تھوڑی سی مٹھائی بچوں کے لئے لائی تھی قبول کر شاد اور آباد رہ۔

بہن منہ دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی اور قمر بچہ کو لے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئی۔

(۳)

دریائے نربدا زور شور سے لہریں لے رہا ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے لہریں چاند پر قربان ہو رہی ہیں اور جنگل بیابان میں درندوں کی خوفناک آواز کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا مشرق میں پہاڑ کی چوٹیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے اور

اژدہوں کی پھنکار نے دریا سر پر اٹھا رکھا ہے پہاڑ کے جنوبی حصہ سے جہاں زبدا اچھل چل کر بہ رہا تھا دفعتہً بانسری کی آواز سنائی دی چاند اس شخص کی بے کسی پر آنسو بہا رہا تھا لنگور پہاڑی بندر اس کے چاروں طرف پھر رہے تھے اور بانسری کی سُریلی صدا نے ساپنوں کو مست کر دیا تھا۔ دریا کے کنارے اس وقت وہ عالم تھا کہ ہر چیز خاموش تھی جب جوگی سب کو مست کر چکا تو اس نے بانسری پھینک دی اور آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "چمک دنیا کے چمکانے والے چاند چمک! مگر میرا مردہ دل نہ چمکیگا۔ یہاں کہ یہ فانی دنیا مجکو میری پیاری بیوی تک نہ پہنچا دے"!

پیپل کے تناور درخت سے مینا کے بچوں کا پیغام صبح ہوا میں گونجا اور تھوڑی دیر بعد پہاڑی کی چوٹیاں آفتاب کی روشنی سے منور ہو گئیں۔

اب جوگی نے بانسری اپنے ہاتھ میں لی اور شہر کا رُخ کیا جا بجا بانسری بجاتا خلق خدا کو دیکھتا اور اپنی حالت پر روتا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ رانی چندراوتی کے محل کے نیچے پہونچا رانی جھروکوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دوپہر کے سنسان وقت میں بانسری کی صدا اثر کر گئی اور اس نے حکم دیا کہ اس جوگی کو حاضر کرو۔ حکم کی تعمیل ہوئی جوگی نے دل کھول کر بانسری بجائی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک رانی اور سپیرہ پر ایک عجیب حالت طاری رہی اس کے بعد جوگی بانسری اٹھا چلنے لگا رانی آگے بڑھی ایک لال انگوٹھی

پیش کی مگر جوگی ہنس کر دعائیں دیتا ہوا آگے بڑھا رانی نے دوڑ کر ہاتھ پکڑ لیا اور انگوٹھی قبول کرنے پر اصرار کیا۔

جوگی۔ مہارانی ہم جنگل کے بن باسی اس سونے روپے کو کیا جانیں۔ تیرا دھن دولت تجکو مبارک ہو۔

رانی۔ مہاراج میں دکھیاری ہوں میرا پتیم مجھ سے چھوٹ گیا مجھ پر دیا کرو اور اپنی بپتا سنا دو۔

جوگی۔ رانی چندراوتی میری بپتا سنسار سے نرالی ہے میں بہت بڑے باپ کا پوت مسلمان ہوں اور اس دیس میں پردیسی ہوں مجھے دنیا میں صرف ایک چیز عزیز تھی اور وہ میری استری میری بیگم قمر تھی جو مجھ سے ہمیشہ کو چھوٹ گئی میں حج کو گیا تھا جب بمبئی واپس پہنچا ہوں تو اس کی بھاوج کا خط ملا کہ قمر دنیا سے سدھار گئی مہارانی ہو دل قدرت کے ایک کھلے ہوئے پھول کی نذر ہو چکا تھا اب اس کا زندہ رہنا بے عزتی اور بے غیرتی تھی وہ دن آج کا دن جنگلوں کی خاک چھان رہا ہوں اور اس وقت کا منتظر ہوں جب میری روح اس دنیا سے رخصت ہو کر میری پیاری قمر تک پہنچ جائے۔

(۴)

جج۔ یقیناً اس بچہ کے خون کی تو مرتکب ہوئی اور یہ تمام رونا پیٹنا لغو اور فضول ہے اگر تو اب بھی سچ نہ کہے گی تو قانون اپنا کام کرے گا اور تو کل صبح پھانسی پر لٹکا دی جائے گی۔

عورت۔ میں سچی بات کہہ چکی کوئی ماں اپنے بچہ کو قتل نہیں کر سکتی میں بیگناہ تن تنہا بے یار و مددگار ہوں کوتوال شہر جو مجھ سے

نکاح کا خواہشمند تھا اس نے میرے انکار پر میری آنکھوں کے سامنے میرے کلیجہ کے ٹکڑے کو ذبح کیا ہے آپ حاکم ہیں۔ میرا انصاف کیجئے اور مجکو میرے بچہ سے ملا دیجئے۔

جج۔ تیرے دعوے کا ثبوت نہیں ہے پیش کر اگر تیرے پاس کوئی گواہ ہے۔

عورت۔ بیکسوں کا گواہ کوئی نہیں ہوتا۔ میرا گواہ صرف وہ خدا ہے جو میرا اور کوتوال شہر کا خالق ہے میں نے اپنا لال قربان کیا اور اپنی عزت بچا لی اگر موجودہ دنیا میں میرا انصاف نہیں ہے تو میرا انصاف اس دنیا میں ہوگا جہاں ہر فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہے۔

جج۔ تو اس بچہ کی لاش کو دیکھ جس کی تو قاتل ہے اور بتا اگر واقعی یہ تیرا بچہ ہے۔

عورت۔ مجکو اب اس کے دیکھنے کی ضرورت نہیں پھانسی کا حکم دیجئے کہ تمرا اپنے شوہر اور بچہ سے جلد مل جائے۔

جج۔ دیکھ کیا واقعی تیرا بچہ ہے۔

عورت۔ نہیں نہیں میرے بچہ کی معصوم روح کبھی کی اپنے باپ سے جا ملی یہ کوئی اور بچہ ہے جو قتل نہیں ہوا اگر اپنی موت سے مرا ہے۔

جج۔ تو اس کوتوال کو پہچانتی ہے۔

عورت۔ مجھ پر احسان کیجئے اور جلد میری موت کا حکم دیجئے میں خونی ہوں۔ پھانسی تیار کیجئے کہ میں اس ظالم قاتل کی صورت نہ دیکھوں

عورت کی گفتگو ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ سامنے کا دروازہ

کھلا اور قمر کا لال دوڑ کر ماں کے گلے سے لپٹ گیا۔ بدنصیب ماں اپنے مقتول بچہ کو زندہ دیکھ کر حیرت میں تھی کہ اس کا شوہر قدموں پر گرا اور آواز کہا۔

"او بیگم! یہ الزام قتل نہیں تھا۔ ایک آزمائش تھی تا کہ مجھکو معلوم ہو کہ جس بی بی کی حقیقی بھاوج نے اس کی موت کی خبر دی وہ کس حد تک پارسا ہے میں اپنی زندگی قربان کر چکا تھا اور رانی چندراوتی کے حکم سے اس شہر کا کوتوال مقرر کیا گیا تو جب میں نے پہلے روز تجھ کو شہر میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے اُسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ میں نے آزمائش کی اور تجھ کو جوہر عصمت سے جگمگاتا دیکھا آج قمر اور اس کا غلام شوہر دونوں زندہ ہیں میری غلطیوں کو معاف۔ قمر جہاں بیگم دنیا نہ ہو گی مگر تیرا نام زندہ ہوگا۔ آنیوالی بیبیاں تجھ پر فخر کریں گی اور تو وہ نام چھوڑے گی کہ فانی دنیا ہمیشہ ہمیشہ اسکو سر آنکھوں پر۔"

"عصمت" جنوری ۱۶ء

تیغ کی ستق

بادشاہ حکومت کے زعم میں اس لئے کہ گرد و پیش کا ہر ذرہ اس کے خیال کی تائید کرتا ہے بظاہر اپنا ہر فعل جائز و مستحسن سمجھتا ہے بیگناہ کا قتل روا مظلوم پر ستم جائز۔

دولت مند اپنی دولت کے نشہ میں تعمیر مکان کے وقت اس میں کوئی خرابی نہیں دیکھتا۔ کہ غریب پڑوسی کی جھونپڑی بالجبر چھین کر اپنا صحن وسیع کرلے۔

طاقتور اپنی طاقت کے گھمنڈ میں یا غصہ کے جوش میں کمزور کو فنا کر دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

"تنازع للبقا" میں ہر طاقتور یہ حق رکھتا ہے کہ کمزور کو تباہ کردے مگر قدرت نے یہ حق صرف جانوروں تک محدود رکھا ہے انسانیت کی کسوٹی پر یہ تمام مذموم حرکات اخلاق سے گرجاتی ہیں اور وہی قدرت جو جانوروں کے فعل کو جائز سمجھتی ہو اسی فعل کو انسانیت میں ناجائز قرار دیتی ہو۔

ظالم سنگدل، جابر، ایک خاص وقت میں کیسے ہی سنگین جرم کا مرتکب ہو مگر قدرت نے ہر اس ہستی کو جس پر انسانیت کا اطلاق ہو سکتا ہو ایک خاص جوہر سے مالامال کیا ہو جسکا نام ضمیر ہے۔ یہ ناممکن ہو کہ کوئی شخص اپنی تمام عمر میں کسی نہ کسی وقت، کسی نہ کسی موقع پر، کسی نہ کسی حال میں تازیانہ ضمیر سے

محفوظ رہے دوران حیات میں وہ وقت آتا ہے۔ کہ تمام حرکات کسی نہ کسی پیرایہ میں اخلاق کی بدترین تصویریں بن کر سامنے آتی ہیں ؛

مذہب نے اسی اصول کو اس صورت میں ادا کیا ہے کہ نیک روحیں نورانی فرشتوں کی معیت میں دنیا سے وداع ہوتی ہیں اور ارواح خبیثہ خوفناک اور ڈراونی۔ کیسا تھ

علم النفس کا فیصلہ یہ ہے کہ جب دماغ افکار دنیا سے آزاد ہو کر موت کے قریب پہنچتا ہے اسوقت اعمال گزشتہ از ابتدا تا انتہا مجمع ہوتے ہیں اور انسان معلوم کر لیتا ہے کہ اس کا کون سا قول اور عمل کیا معنی رکھتا تھا۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو ان کا ضمیر زندگی میں اُن کے اعمال و افعال کی حیثیت پر متوجہ کرے اور وہ اپنی غلطی و غفلت کو محسوس کریں۔ مگر اس کے ساتھ ہی بدبخت اور جانور ہیں وہ انسانی ہستیاں جو اپنی غلطی پر مصر ہوں اور ان کا ضمیر زندگی میں ان کی اصلاح نہ کرے۔ اسی قسم کا ایک انسان میرزا نصیر تھا جس نے اپنی سب انسپکٹری کو بادشاہی سمجھا اور ہر قسم کا ظلم جائز خیال کیا۔ وہ کسی غریب باپ کا بیٹا نہ تھا۔ جائداد گاؤں مال و متاع روپیہ پیسہ غرض سب ہی کچھ موجود تھا بیوی تھی بچے بھی تھے۔ المختصر دنیا کی کوئی خوشی ایسی نہ تھی مرزا جس سے محروم ہو اس کی عظیم الشان حویلی یا محلسرا خاصہ قلعہ تھا۔ اور اگر میرزا میں انسانیت کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ خدا کی اس نعمت پر کہ حکومت دی اور گھر کی دی ہزاروں شکر کرتا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ شقی القلب کس طبیعت کا آدمی تھا کہ خدا کے ہر انعام کو ٹھکرایا اور ہر کرم پر لات ماری۔ ایسا پھرا کہ اسلام تو درکنار اس نے انسانیت ہی کو سلام کیا۔

سلیمہ محل سرا کے متصل ایک غریب بیوہ رہتی تھی۔ لاریب جوان تھی

حسین تھی۔ مگر جس آن بان سے اس نے بیوگی کے تین سال اس طرح بسر کر دیئے کہ کسی نے اس کا آنچل تک نہ دیکھا وہ حق رکھتی تھی کہ ایک میرزا نصیر کیا ہر مسلمان جو کلمہ توحید کا معترف ہو اس کی قدر کرے۔ سلیمہ نگوڑی ناٹھی نہیں دو بچوں کی ماں تھی اس کا بڑا بچہ چھ اور چھوٹا تین سال کا تھا۔ بظاہر گذارے کی صورت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ محنت کرتی اور بچوں کا پیٹ پالتی۔ اس کی مفلسی کا حال میرزا کے علم میں تھا۔ اس نے سلیمہ کو اپنے جال میں پھنسانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ لیکن وہ ہنستا تھا اور دل میں کہتا کس قدر بدنصیب عورت ہے۔ تاہم اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ میری حکومت اور دولت ایسی چیز نہیں ہے کہ اس ٹکر گدی سلیمہ کو خاموش بیٹھنے دے۔ میری ہی کوشش میں کمی ہے ورنہ میرے پاس ایسے اسباب موجود ہیں کہ جس وقت چاہوں چشم زدن میں سلیمہ جیسی پچاس کو باہر کھینچ لاؤں۔

وقت گذرتا اور وقت کے ساتھ ہی مرزا کی ضد بڑھتی گئی اور ضد کے ساتھ غصہ تیز ہوتا گیا۔

وہ رات جس کی صبح عید تھی جہاں ہزارہا مسلمانوں کے واسطے پیام مسرت لائی وہاں کچھ اللہ کے بندے ایسے تھے جن کی آنکھ سے رات بھر آنسو نہ تھما۔ انہیں میں ایک سلیمہ تھی جو شام سے مختلف افکار میں ڈوب گئی ایک درد تھا جو رہ رہ کر اس کے دل میں چٹکیاں لیتا تھا۔ ایک کسک تھی جو عارضی سکون کے بعد اسکو مضطرب کر دیتی تھی چاہتی تھی کہ دونوں بچوں کو سینہ سے چمٹا کر صبح کر دوں مگر دماغ کسی کروٹ چین نہ لیتا اور دل کسی عنوان قابو میں نہ آتا۔ سوچتی تھی کہ کل روز عید ہے زیادہ نہیں آج سے تین چار سال ہی پہلے میرے سامنے بھی یہ دن خوشیوں کا مرکز تھا، میرے گھر میں بھی مسرتوں کی بہار آتی تھی اور میرے

بچے بھی نئے نئے کپڑے پہن کر اس لطف میں شریک ہوتے۔ آج وہی میں ہوں وہی گھر ہے وہی بچے ہیں اور وہی رات ہے۔ مگر کل نہ ان کے بدن پر اُجلا کپڑا ہوگا اور نہ ان کے چہرہ پر خوشی کے آثار تنگی ترشی انسان ہی کے واسطے ہے۔ بہت سی اللہ کی بندیاں مجھ سے بھی بدتر حالت میں زندگی بسر کر رہی ہوں گی، مگر مجھ پر یہ مصیبت کیسی آئی کہ مرزا کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتا کیا کروں اور کس طرح رہائی پاؤں۔ یہ کیسا غضب ہے کہ حکومت کے ڈر سے یہ بیسیوں مسلمان جو میرے پڑوسی ہیں اسی کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ یقیناً میرے واسطے سب سے بہتر کام خودکشی تھی کہ میں ان مصائب سے چھٹکارا پاتی۔ مگر میرے بے بس بچوں کا کیا حشر ہوگا۔ یہ ایسی زنجیر پاؤں میں آپڑی ہے کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سلیمہ اتنا کہہ کر اُٹھی اور سوچنے لگی بلا سے اس گھر ہی کو آگ لگاؤں اور نکل جاؤں لیکن کس کو غرض پڑی ہے کہ میرے لئے مکان ڈھونڈے اور اس مصیبت سے چھٹکارا دلوائے۔ روتی رہی اور ٹہلتی رہی دفعتہً حمیت نسوانی نے دہان پان ہڈیوں میں حرارت پیدا کی اور وہ کہنے لگی، بلاشبہ میں ایک کمزور عورت ہوں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ مرزا کی دولت یا حکومت مجھ پر غالب آجائے۔ میں مردانہ وار اس کا مقابلہ کروں گی۔ وہ کہتا ہے کہ زنانہ گھر میں گھس آؤں گا اور محلہ میں ایک متنفس بھی اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ میری حمایت کو کھڑا ہو۔ میرا کمزور جسم گو مقابلہ کے لائق نہیں۔ لیکن میں اپنی لاج پر قربان ضرور ہو سکتی ہوں۔ میں۔ اگر کچھ اور نہیں کر سکتی تو کم از کم جب میری بدبخت آنکھیں اس وقت سے دوچار ہوں گی کہ میرزا کے ناپاک قدم اس چار دیواری میں داخل ہوں تو اس چاقو سے میں اُس کا نہیں تو اپنا خاتمہ

کردوں گی۔ مجھے اگر فکر ہے تو صرف ان بچوں کا مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہوگا جو ان بچوں کا بیڑا پار کردے گا۔ اور سب سے بڑا کفیل خدا ہے اس سے بہتر ماں اور اس سے اچھا باپ کون ہوگا۔ رات آدھی کے قریب گذر چکی تھی اور سلیمہ ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں گھر کے چکر کاٹ رہی تھی کہ اس کے چہرہ پر ایک خفیف آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ میں صبح ہی حاکم شہر کے پاس جاکر فریاد کروں مگر پھر خیال آیا کہ آجتک گھر سے باہر نہ نکلی غیر مرد سے بات نہ کی اجنبی آدمی کی صورت نہ دیکھی۔ کہاں جاؤں گی کیونکر جاوں گی کس سے کہوں گی اور کس طرح کہوں گی اب جوش نے اور ترقی کی اس کی آنکھ سے شعلے نکلنے لگے اور اس نے کہا کہ میں پڑھ چکی ہوں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مرزا جو مصیبت مجھ پر لایا ہے ایسی ایسی مصیبتیں خدا کی پاک بندیوں پر پہلے بھی آئی ہیں اور دنیا کی تاریخ میں میری قربانی پہلی ہی نہ ہوگی ہزار ہا عصمت کی دیویاں اس میدان میں منزل مقصود پر پہنچیں اور اُف نہ کی۔ انہوں نے جفا شعار مردوں کو دکھلا دیا کہ عورت کوئی وقعت رکھتی ہے آج وقت کی بات ہے کہ خود میرا ہمسایہ ایک معمولی تھانہ دار کی خوشامد میں میری بربادی جائز سمجھتا ہے"

سلیمہ کے خیالات کا سلسلہ یہاں تک پہونچا تھا کہ رات کے سناٹے میں جب ہر طرف خاموشی طاری تھی اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنی کلیجہ دھک سے رہ گیا مگر سنبھلی۔ خاموش تھی کہ دروازہ پر پھر آواز آئی ہمت نہ پڑی کہ کچھ پوچھے مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا نہ ہو کہ مجھے سوتا سمجھ کر مرزا مکان میں کود پڑے آگے بڑھی اور بمشکل تمام کانپ کانپ کر بہت ہی مری ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے؟" جواب میں ایک عورت کے یہ الفاظ سُنے کنڈی کھولدو" جس طرح ڈوبتا

ہوا آدمی ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اسی طرح سلیمہ نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی کہ شاید کوئی طاقت مجھے اس ظالم کے پنجہ سے چھڑا سکے۔ مگر اندھیرے گھپ میں تاروں کے سوا جو سر پر چمک دمک رہے تھے کوئی چیز نظر نہ آئی آواز دوبارہ سہ بارہ اور چند لمحہ میں پانچ سے سات آٹھ مرتبہ آچکی تھی دل کڑا کیا اور پوچھا کون ہے؟ کیا کام ہے؟

باہر کی عورت نے منت و خوشامد سے کہا "غیر نہیں تمہاری پڑوسن شمسہ ہوں۔ صبح عید ہے تمہارے لئے جوڑا تمہارے بچوں کیلئے کپڑے اور خرچ کے لئے روپے لائی ہوں۔ شام کو مکاندار کرایہ کا تقاضا کر رہا تھا میں سن رہی تھی۔ بہت کیا کروں عورت تھی نہیں تو کمبخت کا منہ نوچ لیتی۔ غضب خدا کا شریف زادیوں کو یوں کہے کہ چٹیا پکڑ کر نکال دوں گا۔ داروغہ جی نے اسکو بہت ڈانٹا اور شاید مارا بھی ہے اُس نے تم کو صبح تک کی مہلت دی لو یہ روپے لو اور اس کا کرایہ ادا کرو۔" شمسہ کی تقریر نے سلیمہ کے رہے سہے حواس بھی کھو دئے وہ جانتی تھی کہ شمسہ کو اسقدر ہمدردی کی ضرورت نہ واسطہ، آج دوپہر ہی کو کمبخت بیٹھی ہوئی آسمان و زمین کے قلابے ملا رہی تھی مرد اگر لغویت کر رہے ہیں تو حق بجانب ہیں کہ وہ احساس سے محروم ہیں افسوس اس کا ہے کہ شمسہ عورت ذات ہو کر اسی گڑھے میں لیجا رہی ہے جس کے بعد صرف دوزخ باقی رہتی ہے سلیمہ ڈر رہی تھی کہ شمسہ کے ساتھ مرزا نہ ہو کھانسی کی آواز نے اس ڈر پورا کر دیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ اس راز کی حقیقت کیا ہے اور یہ سازش آدھی رات کے وقت کس واسطے کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہوش اڑ گئے اس کے سوا کیا کر سکتی تھی کہ دونوں بچوں کو جگا دیا کوٹھے پر چڑھ کر اندر سے کنڈی لگا لی۔ اب دونوں طرف گھر کے اندر انگنائی میں اور کوٹھے پر

گلی میں ایک سناٹا تھا جس کو مرزا کے ان الفاظ نے توڑا "کوشش کی حد ہو چکی اب تیرے سر پر شامت سوار ہے جو کر رہی ہے وہ بھگتنا پڑے گا۔"

سلیمہ اس کا کچھ جواب نہ دے سکتی تھی اور نہ دیا۔ چند لمحہ خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد مرزا کے پھر یہ الفاظ ہوا میں گونجے۔

"میں ابھی دروازہ توڑ دیتا ہوں۔"

ایک بیکس و لاچار عورت جس کے والی وارث قبروں میں جا سوئے چھت پر کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہیں کلیجہ دہاڑو ہلڑ کر رہا ہے نیچے زمین اوپر آسمان۔ سامنے معصوم بچے وہ بھی نیند میں غرقاب روتے اور بسورتے، چاہتی تھی کہ مرزا سے گفتگو کروں مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ جب یہ سنا کہ دروازہ توڑ دوں تو آپے سے باہر ہو گئی اور اسی غصہ میں بآوازِ بلند پکارا۔

"کیا کوئی اللہ کا بندہ مجھکو ظالم سے بچانے والا ہے؟"

مرزا کا اثر محلہ پر پورا تھا مگر چور کے پاؤں کہاں اسی وقت بھاگا مگر غصہ کی یہ کیفیت تھی کہ ساری رات انگاروں پر لوٹتا رہا خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو ایک نوزائدہ بچہ کے گلا گھونٹنے کی فرضی رپورٹ درج کر تحقیقات شروع کردی ایک بازاری عورت نے دائی کی حیثیت میں بچہ کو شناخت کیا اور دوپہر سے پہلے پردہ نشین سلیمہ بازاری عورت کے نام سے پولس کی حراست میں تھی۔

آج کا دن سلیمہ پر کیسا گذرا اس کا اندازہ بہت مشکل ہے جس کا آنچل بھی غیر مرد نے نہ دیکھا تھا وہ بے برقع اور بے نقاب ہزاروں کے سامنے

کھڑی تھی اور ہر طرف سے لعن طعن ہو رہی تھی۔ جب حوالات کی رات بدنصیب بیوہ کے سر پر آئی تو وہ اپنے بچوں کو یاد کر کے تڑپ اُٹھی۔ دیواروں سے سر پھوڑتی تھی ٹکریں مارتی تھی مگر سب بے سود تھا رات ختم ہوئی اور صبح سامنے آئی تو سپاہیوں نے باہر نکالا۔ مرزا نے دانت پیس پیس کر گالیاں دیں اور ٹھیک دس بجے بدبخت سلیمہ کچہری روانہ ہوئی۔ اس وقت ایک سپاہی سے اس نے بہ منت خواہش کی کہ کوئی برقع ملجائے۔ لیکن مرزا نے برقع کے جواب میں ہزارہا باتیں سنائیں اور آخر کار وہ وقت آگیا کہ جو آواز تک دوسروں کو نہ سناتی تھی وہ کھلے چہرہ عدالت میں پیش ہوئی۔ برقع پوش بازاری عورت نے شہادت دی کہ میں دائی ہوں اور یہ بچہ اس بازاری عورت کے ہاں میرے ہاتھوں پیدا ہوا۔ گواہیاں اور بھی ہوئیں عدالت نے ہرچند کوشش کی کہ ملزمہ کسی بات کا جواب دے لیکن ہر متنفس متحیر تھا کہ ملزم عورت بیری کی طرح کانپ رہی تھی اسکی نگاہ اونچی نہ ہو سکتی تھی اور تمام جسم پسینہ میں تر اور تھا وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی سن رہی تھی جو کچھ ہو رہا تھا، اور انگیز رہی تھی جو کچھ کیا جا رہا تھا، لاکھ کوشش کی گئی کہ عورت کسی بات کا جواب دے چہرہ سے ہاتھ اُٹھائے مگر نہ ہاتھ اُٹھے نہ بات کا جواب ملا۔ وکلاء کی جماعت بھی متحیر تھی ایک شخص نے صاف کہدیا " یہ مکر بیکار ہے جواب نہیں دیتی تو یقین کر کہ پھانسی ہو گی"۔ لیکن ملزم عورت کی حالت لحظہ بہ لحظہ بدتر ہوتی گئی۔

وکلاء کی درخواست پر عدالت کے حکم سے عورت علیحدہ کمرہ میں بھیجدی گئی اور ایک لیڈی ڈاکٹر اس غرض سے بلائی گئی کہ اس کو دیکھے۔ ملزم عورت نے لیڈی ڈاکٹر سے صرف اتنا کہا۔

"مجھے پھانسی منظور ہے مگر میری بے پردگی نہ ہو۔"
عدالت کے کمرہ میں جس وقت یہ الفاظ گونجے تو وہ بازاری عورت جو دائی بنی تھی آگے بڑھی۔ اُس نے دیکھا کہ آنسو کی لڑیاں زار قطار عورت کے رخساروں پر بہہ رہی ہیں سلیمہ اس کو دیکھ کر کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔
"تم نے جو کچھ کیا سب صحیح ہے مگر خدا کا واسطہ مجھے بھی کوئی برقع منگا دو۔"

ملزم کے الفاظ شاہد کے کلیجہ میں گڑ گئے اور آسمان نے لعنت بھیجی۔ کمرہ عدالت میں چلا اُٹھی اپنا برقع اس کے سر پر ڈال کر کہا۔ "برقع کی حقیقی مستحق یہ ہے۔"

اس کے بعد اس نے تمام واقعہ بیان کیا اور آخری الفاظ یہ کہے "سزا مجھکو ملنی چاہیئے کہ مرزا کی وجہ سے جھوٹی گواہی دیکر اسکو بے پردہ کیا اور اس کے معصوم بچے اس سے چھٹوا دیئے۔
چند لمحہ تک سناٹا رہا اس کے بعد عدالت کے حکم سے مرزا گرفتار کیا گیا اور بدبخت سلیمہ گھر پہونچکر اپنے بچوں سے ملی۔
بازاری عورت نے جس کو راہ راست پر لانے والا صرف اس کا ایمان تھا سلیمہ کے قدموں پر سر رکھا اور جب تک زندہ رہی اس کی بن داموں کی لونڈی تھی۔

"عصمت" مئی ۱۹۲۵ء

غلط فہمی

کہتے ہیں انسان مردہ پسند ہے بدتر سے بدتر آدمی جس کی زندگی ہر اعتبار سے قابل ملامت ہو۔ موت اس کو بھی اچھا بنا دیتی ہے۔ کیوں کہتے ہیں اس لئے کہ تعلقات ختم ہوئے، توقعات فنا ہوئیں۔ حکایت بے سود، شکایت لاحاصل۔ شوکت جہاں کی بیوگی اسی ذیل کا ایک واقعہ اور نتیجہ بیوگی اسی اصول کا انجام ہیں۔ ساس نندوں کی نوک جھوک دیورانیوں جیٹھانیوں کے طعن و طنز سب شوہر کے دم تک تھے۔ جب نونہال کے ظالم ہاتھوں نے سہاگ کا عروسی جوڑ اُتار کر رنڈاپے کی سیاہ چادر اوڑھائی تو وہ جھگڑے ٹنٹے جو چمن حیات میں کانٹوں کی طرح کھٹک رہے تھے رخصت ہوئے۔ اب شوکت جہاں سسرال کی بہو نہیں ساس سسروں کی مہمان تھی اور وہی زبانیں جو دن رات زہر اگلتی تھیں ہر وقت خاطر مدارات میں مصروف ہو گئیں ساس سسرے ہی نہیں بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ واسطہ ختم ہوا نکاح کے شاداب پھول مرجھا چکے اور اب یہ عدت کی مدت بھی یہاں پوری کر لے تو اس کا کرم۔

سہاگن شوکت جو شوہر کی زندگی میں ساس کی آدھی بات کو پھانس اور جیٹھانی کی سیدھی بات کو بھی چھیڑ خانی سمجھتی تھی۔ اب بیوہ ہو کر کچھ ایسی مخبوط الحواس ہوئی کہ ساس ہو یا دیورانی نند ہو یا جیٹھانی اس کو

کسی کا ہوش نہ تھا۔ اس چکور کی طرح جو شب ماہ میں چاند کی طرف اس وقت اڑتی ہے کہ طاقت پرواز ختم ہو جائے۔ وہ شوہر کی یاد میں ہر لمحہ مستغرق تھی وہ فضائے تخیل میں چاروں طرف ٹکراتی تھی۔ صبح کی خاطر تواضع اور شب گذشتہ کی طعن تشنیع دونوں ایک تھے آہ نیم شبی نالہ صبح یاد محبوب غرض اس کے سوا ذہن میں کچھ نہ تھا۔

دور عدت ختم ہوا اور آج کے غسل نے رنڈسالہ اتارتے ہوئے شوکت کو بار نکاح سے سبکدوش کر آزادی کا ڈھنڈھورا پٹوا دیا۔ مگر اس قید پر جس سے وقت کی طاقت نے اس کو رہا کیا ہزار ہا آزادیاں قربان تھیں بظاہر فتنہ آمیز رشتے اس وقت سرنگوں اور قیامت خیز کانٹے جو پہلو سوہان روح تھے پھول ہو گئے لیکن جلوہ حبیب کی کوشش ناکام ہر حالت پر غالب تھی۔ میکے سے طلبی کا پیام آیا۔ اس سے پہلے بھی شوکت کئی مرتبہ میکے گئی مگر یہ روانگی مفارقت ابدی تھی جانے والی نے رو رو کر اپنا اسباب درست کیا اور بھیجنے والے جن کے اختیارات سلب اور جن کا تعلق فنا ہو چکا تھا خاموش کھڑے اس لڑکی کو جو کبھی ان کی اور آج بالکل غیر تھی دل کے آنسوؤں سے وداع کر رہے تھے سامان چلا گیا تو شوکت اٹھی کمرہ سے باہر آئی۔ چاروں طرف دیکھا در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی۔ سناٹا طاری تھا۔ ایک درد آمیز نظر ہر سمت ڈالی آنکھ سے زار و قطار آنسو بہ رہے تھے "خدا حافظ" کہہ کر آگے بڑھی دل بگڑ رہا تھا اور مرنے والے شوہر کی تصویر ہر ہر گوشہ اور کونہ سے نکل کر پاؤں پکڑ رہی تھی۔ دروازہ میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ انسانی دنیا کی وہ بد نصیب ہستی جس کو رشتہ ساس کے

نام سے تعبیر کرتا تھا اور جس نے آج سے دو سال قبل ہزاروں امنگوں
اور ارمانوں سے اس دلہن کی پالکی کا استقبال کیا تھا اب کلیجہ کے
ٹکڑے کو خاک میں ملا کر بہو کو رخصت کرنے کے واسطے تیار ہے۔
صورت دیکھتے ہی بے اختیار ہو گئے۔ آنسو ہچکیوں سے بدلے اور
آخری سلام کو جھکی تو ساس بے قابو ہو گئی۔ کمر پر ہاتھ اور سر پر منہ
رکھ دیا یہ وہ وقت تھا کہ بدنصیب ساس کے خیالات نے پلٹا کھایا
شوکت نصرت سے ہمت اضطراب سے اور استقلال بے تابی سے
تبدیل ہوئے۔ شوکت نے گلے میں باہیں ڈالدیں تو ساس کا دل مجروح
تڑپ اٹھا، خاموش آنکھیں پھوٹ پڑیں اور تھپر دل بلبلا گیا کہنے لگی۔

"بی بی! وقت گزر گیا اور وقت کے ساتھ ہی نصرت میاں اپنے
اصلی گھر سدھار گئے۔ مگر میری آنکھوں میں وہ سماں اور چہل پہل ابھی موجود
ہے اور دل کہتا ہے دولہا بھی کسی طرف سے اب نکلا چاہتی ہوں خبط ہے
مگر کیا کروں جب تمہارے عروسی دوپٹہ کا آنچل اس زمین نے اپنے منہ پر
ڈالا اس وقت آسمان ہنس رہا تھا اور کسے خبر تھی کہ اس خوشی کی تہ میں یہ
صدمہ پوشیدہ ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ جس دولہا کا مکھڑا دیکھ کر باغ
باغ ہو رہی ہوں اس کا کفن بھی دیکھنا پڑے گا اور جس دولہن کو ستر برس
کی بیوی بنا کر لائی ہوں وہ دو ہی سال بعد ہمیشہ کو بچھڑ جائے گی بیٹی! سہاگن بن
کر آئیں اور رانڈ ہو کر چلیں۔ آج میرا تمہارا رشتہ قطع اور معاملہ ختم ہو تاہم
اب تم کہاں اور یہ گھر کہاں دعا ہے کہ جہاں رہو خوش اور آباد۔ اور یہ
فانی دنیا جو میرے لئے ناشاد و نامراد ہوئی تمہارے واسطے جنت اور
راحت ہو۔ نصرت کی موت جو زخم سینہ میں ڈال گئی اس کا مرہم تمہارا

دم تھا۔ آج وہ پھایا اترتا ہے اب میں ہوں گی عالم خیال اور میرا لال
کہتی نہیں اس لئے کہ منہ نہیں۔ مجبور نہیں کرتی اس واسطے کہ حق نہیں۔
التجا کرتی ہوں منت و خوشامد سے غربت و عجز سے واسطہ دیکر ان ہڈیوں
کا جو کبھی تمہاری تھیں اور آج قبر کی ہیں۔ کہ چند روز اور گذار دو۔"

شوکت کی عزیز سہیلی نسیم حسن اتفاق سے دیوار بیچ بیاہی ہوئی آئی۔
چوتھی اور چالوں تک تو دونوں کی حسرت دل ہی دل میں پوشیدہ
رہی۔ مگر دولہا کا ختم رخصت پر واپس جاتا تھا کہ شوکت کے وقت
کا بیشتر حصہ نسیم کے پاس گذرنے لگا۔ بچپن کی محبت پردیس میں اور
زیادہ وسیع ہو گئی۔ نسیم کی نئی سسرال تھی تکلف اور شرم و حیا
دونوں موجود تھے شوکت نعمت ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی
کہ رات کو بھی کبھی کبھی وہ وہیں سو جاتی مگر نسیم کی سسرال نے اسکو وبال سمجھا
اور ہر وقت چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ شوکت کی محبت کچھ زیادہ تعجب انگیز
نہیں اس کے سامنے نسیم کے سوا کچھ تھا ہی نہیں مگر نسیم کی حالت یقیناً حیرت
انگیز تھی کہ وہ شوکت کی محبت کا استقبال سر سے کرتی آنکھوں سے کرتی دل سے کرتی
ساس کا اعتراض نند کی فتنہ پردازی سب بالائے طاق رکھی اور شوکت کی محبت میں
ایسی اندھی ہوئی کہ اگر دم بھر کو بھی وہ آنکھ سے اوجھل ہوتی تو بیتاب ہو جاتی رہی
شوکت اسکی کیفیت یہ تھی کہ وہ تو خواب بھی دیکھتی تھی تو نسیم کا۔ دونوں کچھ ایسی اس
جال میں گرفتار ہوئیں کہ جو سنتا وہ اچنبھا اور جو دیکھتا وہ تعجب کرتا ہوتے ہوتے یہ خبر
شوہر کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے بیوی کو لکھا کہ یہ کیا شہرت ہو رہی ہے۔ مگر نسیم
نے شوہر کے خیال کی بھی پرواہ نہ کی۔

یہ واقعہ ہے کہ اس محبت کی ابتدا شوکت کی طرف سے ہوئی اور وہ

حق رکھتی تھی کہ دنیا میں کسی سے محبت کرے یہ محبت اسلئے کہ اس کی اپنی جنسیت پر ختم ہو رہی تھی بالخصوص ان حالات میں کہ جماعت عقد ثانی کو مذموم تصور کرتی تھی کسی طرح قابل اعتراض نہ تھی۔ یہ کس قدر ظلم تھا کہ وہی لوگ جو ایک جوان لڑکی کے دوسرے نکاح کو گناہ کبیرہ سمجھ رہے تھے اس کو اتنی اجازت بھی نہ دیتے تھے کہ وہ اپنی بچپن کی سہیلی کے ساتھ مل جل کر زندگی کے دن ختم کر دے۔ البتہ بحث ہو سکتی ہے شمیم کی محبت پر کہ وہ ملکیت تھی زرخرید تھی لونڈی تھی ایک مرد کی، اور مجبور تھی۔ اس کا فرض تھا اسکی انسانیت تھی اسکا مذہب تھا کہ محبت کے تمام جذبات صرف ایک دائرہ میں ختم کر دے اور شوہر کے مقابلہ میں دنیا کے تمام تعلقات اور زندگی کی ہر خواہش قربان کر دے۔

جب سماعت و بصارت محبت کی قربانیاں ٹھہریں تو احساس حمیت و عزت بھی رخصت ہوا۔ شوکت اور شمیم دونوں منزل محبت کے اس حصہ میں تھیں۔ جہاں ہر طرف سے ان پر لعن طعن ہو رہی تھیں اور ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا کہ ان کا ہم آہنگ ہو رفتہ رفتہ یہ خبر شمیم کے شوہر تک پھر پہنچی اور اس نے اس سلسلہ میں ایک اور نہایت ہی سخت خط بیوی کو لکھا۔ اس خط کا اثر شمیم پر کیا ہوا اندرونی کیفیت کا تو علم نہیں مگر بظاہر اس نے زیادہ پروا نہ کی اور جب شوہر کو یہ خبر پہنچی تو اسکو اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ چند روز کی چھٹی لیکر اس غرض سے گھر آئے کہ بیوی کو ساتھ لیجا کر یہ جھگڑا ختم کر دوں۔

ایک شریف اور نیک بیوی کی طرف سے شوہر کے آنے پر جس قدر اظہار مسرت ہو سکتا ہے۔ شمیم کی طرف سے وہ سب ہو رہا تھا۔ اس نے محبت کی آنکھوں سے شوہر کا انتظار اور شوق کے خاموش قدموں سے دروازہ تک اس کا استقبال کیا۔ یہ معلوم نہیں کہ شوہر کا خط شوکت کے علم میں نہ تھا۔ مگر آج صبح سے وہ

شمیم کے پاس نہ آئی اور باوجود دن کے بارہ گھنٹے گذر جانے کے شمیم شوکت کی جدائی سے ذرہ بھر متاثر نہ تھی یا معلوم نہ ہوتی تھی گاڑی رات کے گیارہ بجے کے قریب پہنچی اور شوہر نے پہلی بات بیوی سے یہ کی کہ اب تک تمہارا تعلق شوکت سے قطع نہ ہوا۔"

حیات انسانی کے مقررہ اصولوں کی طرح مسلمان مرد کے نکاح ثانی کی مقررہ وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ موجودہ بیوی پھوہڑ ہے جاہل ہے یا مریض ہے اسی اصول کے تحت ٹھیک اسی روز جب شمیم کا شوہر پردیس سے آیا شوکت بھی ماں باپ کے اصرار پر ایک بیوی والے شوہر کے پلے باندھ دی گئی دونوں سوکنیں ایک گھر میں تھیں جس وقت شوکت دلہن بنی داخل ہوئی اس وقت بڑی بیوی انگاروں پر لوٹ رہی تھی جفا شعار شوہر نے یہ وعدہ کیا تھا کہ یہ نکاح خود بڑی بیوی کر رہی ہے اور اس نے اپنی علالت کی وجہ سے ہنسی خوشی اجازت دی۔ حالانکہ یہ محض غلط تھا اور ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس ہی جیسی عورت پر جو بیٹی کی ماں بن کر اس کا یقین کر لیتی ہے اور شوہر کی بیوی ہو کر یہ غور نہیں کرتی کہ یہ اجازت کہاں تک قرین قیاس ہے اور باپ سے بہتر اسکا اندازہ کر سکتی ہے اور اسکا اپنا دل اس یقین کی پوری کسوٹی ہے وہ یہ بھی سمجھ سکتی ہے کہ اجازت دینے والی مجھ ہی جیسی معمولی عورت ہے اور اسکا شوہر بھی اسی فطرت کا انسان ہے پیغمبر نہیں ہے۔ الختصر بدبخت ماں باپ کی فرماں بردار بچی شوکت جب سنگدل سوکن کے قبضہ میں پہنچی تو شمیم کی جدائی سے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں سوکن اس کی اپنی سوکن اور شمیم کی نند تھی۔ حالات سے باخبر واقعات سے آشنا دو تین دن میاں بیوی کے خاصے اچھے گذرے۔ مگر شوہر یہ دیکھ کر بھڑک رہا تھا کہ بیوی کے دل میں کوئی پھانس ایسی چبھی ہوئی ہے جو تھم تھم کر کھٹکتی ہے۔ جس کمرہ کی ہوا عطر و گلاب سے

جھلک رہی ہے اس میں کبھی کبھی ایک ٹھنڈا سانس بھی جذب ہو جاتا ہے اور جو نظریں شرم و حیا کے جوہر سے مالا مال ہیں وہ کچھ دیر کو خاموش بھی ہو جاتی ہیں۔ نکاح کا چوتھا روز تھا کہ شام سے کچھ قبل ایک برقع پوش بڑھیا شوکت کے کمرہ میں داخل ہوئی بڑھیا نے دولہن کو اپنے پاس بلایا کچھ دیر تک باتیں کیں اور چلی گئی۔ شوہر متوقع تھا کہ شوکت خود ہی اس بڑھیا کی کیفیت آنے کی وجہ اور گفتگو کا سبب بیان کریگی مگر جب وہ خاموش رہی اور شام تک ذکر نہ کیا تو توقع نے تعجب کا رنگ اختیار کیا اور جب غروب آفتاب کے ساتھ شوکت کا رنگ بدلا اور ٹھنڈے سانس نزع کرنے لگے اور خاموشی ازسر تا پا چھا گئی تو تعجب نے بدظنی کا لباس پہنا اور دورہ اختلاج قلب نے جہاں شوکت کو نیم مردہ کر دیا وہاں شوہر کی بدگمانی کو یقین بنا دیا۔ رات کے آٹھ بجے ہوں گے شوہر کے کان میں شوکت کی بیہوشی کی خبر پہونچی اور اسکے ساتھ ہی بڑی بیوی نے کہا۔

"میں تو کچھ کہہ نہیں سکتی اگر اس وقت کہتی تو تم یقین ہی کیوں کرتے"۔

شوہر۔ میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو شوکت بے ہوش ہو گئی اختلاج قلب کا دورہ ہے۔

بڑی بیوی۔ دورہ کیوں ہوا۔ اس کا سبب کیا ہے؟ تمام دنیا میں ناک کٹ رہی ہے۔

شوہر۔ شبہ تو مجھکو بھی ہے۔ تم مفصل بیان کرو کہ حقیقت کیا ہے؟

بیوی۔ وہ خود ہی اپنی حالت بیان کر رہی ہے میں اپنی زبان سے کیا کہوں۔

شوہر۔ کس طرح بیان کر رہی ہے وہ تو بے ہوش ہے؟

بیوی۔ اس کے پاس دیکھو کیا پڑا ہوا ہے۔

شوہر اور بیوی بے ہوش شوکت کے پاس پہنچے تو پرچے اسکے پاس پڑے تھے پہلا پرچہ اٹھایا تو لکھا تھا۔

"پیاری شوکت محبت کے وعدے ایسے پورے اور نباہ کا اقرار اتنا کمزور سنا ہے نکاح ہو گیا خدا مبارک کرے کل کی ملاقات میں دل کو بات کو ذکر تک نہ کیا۔ خیر شکوہ شکایت کچھ نہیں اللہ انجام بہ خیر کرے جس کی ہوگئیں اسی کی رہو لیکن زندہ اور خوش رہو۔

ش"

یہ پرچہ پڑھ کر شوہر کے حواس باختہ ہو گئے اور جب بیوی کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ وہی پرچہ ہے جو شام کو رقعہ والی لائی تھی تو چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ کہنے لگا "میں ابھی اس کمبخت کا خاتمہ کرتا ہوں" اب بیوی نے دوسرا پرچہ دیا یہ شوکت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور لکھتے لکھتے بیہوش ہوئی تھی۔ لکھا تھا۔

"دل و جان تجھ پر سے قربان۔ آنکھیں تیری صورت کو اور کان تیری آواز کو ترس گئے سنگ دل خدا کا واسطہ صورت دکھا دے"

یہ سطر پڑھ کر شوہر کانپنے لگا۔ کچھ سوچا۔ شوکت کو غور سے دیکھا باہر گیا دوا لایا۔ پلائی۔ خود خاموش ہو بیٹھا شوکت کچھ ایسی گھڑی کی بے ہوش ہوئی کہ دوا درمن بیکار رہی اور بارہ بجے کے قریب ختم ہو گئی۔

شوکت کو مرے چار سال سے زیادہ ہوگئے رات کے دس بجے تھے شوکت کا شوہر اور شمیم کا شوہر دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے اور بحث اس مسئلہ پر تھی کہ بعد نکاح عورت کو شوہر کے سوا تمام تعلقات فنا کر دینے چاہئیں شوکت کے شوہر نے کہا "عورت صرف مرد کے لئے ہے" شمیم کے شوہر نے جواب دیا۔ "مرد کی یہ توقع کہ عورت صرف اس کی ہو کر رہے دراز یا دتی ہوگی۔" باتوں باتوں میں شوکت کا ذکر چھڑا اور شمیم کے شوہر نے کہا۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ شوکت کی موت کا سبب صرف شمیم کی جدائی ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کی عاشق زار تھیں اور تعجب یہ تھا کہ شمیم جیسی فرمانبردار بیوی نے شوکت کی خط و کتابت مجھے بمشکل دکھائی آخری خط جواب تک مجھے یاد ہے اور جس کا جواب شمیم نے بھی ایسا لکھا کہ ہمیشہ یاد رکھوں گا نسوانی جذبات کی پوری تصویر ہے۔"

شوکت کا شوہر۔ کیا یہ خط شمیم کا تھا؟

شمیم کا شوہر۔ جی ہاں۔

اس کے بعد شوکت کے شوہر کا سر کئی منٹ تک اوپر نہ اُٹھ سکا وہ دیر تک کچھ ٹہلا اور خاموش ہو بیٹھا۔ چند لمحہ بعد اس نے اس وقت جب اس کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے صرف اتنا کہا۔

"شوکت میری غلط فہمی کا شکار ہوئی۔"

"عصمت" اپریل ۱۹۲۳ء